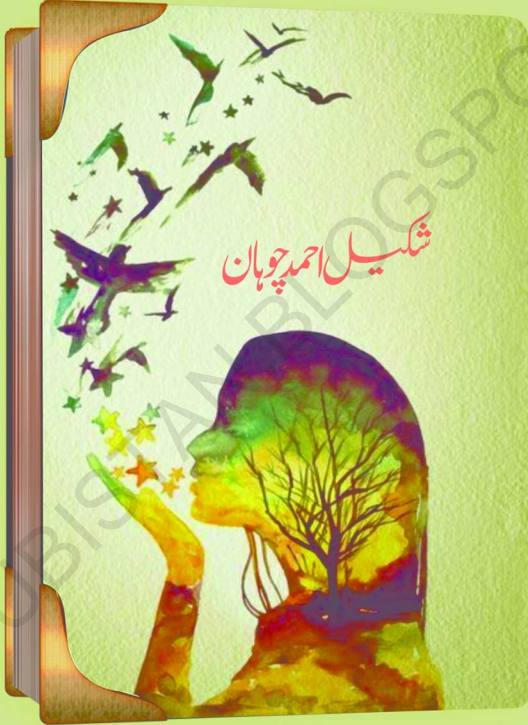


زندگی کے بعد.... موت سے پہلے

(افسانے)



دارالمصنفین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

مصنف

شکیل احمد چوہان

دارالمصنف

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں۔

کتاب	:	زندگی کے بعد... موت سے پہلے
مصنف	:	شکیل احمد چوہان
سال اشاعت	:	جنوری 2016ء
ڈیزائنر	:	سعید قاسم
کمپوزنگ	:	محمد وقاص ایوب
ناشر	:	دارالمصنف

اسٹاکسٹ:

دارالمصنف، 37 فرسٹ فلور، گوہر سنٹر وحدت روڈ، نزد مسلم ٹاؤن موڑ، لاہور

darulmashaf@gamil.com 042-35912676 , 0334-9892450

ملنے کے دیگر پتے:

- ☆ مکتبہ نقوش اسلامی، دکان نمبر 11، گراؤنڈ، مسلم سینٹر، چوڑی روڈ، اردو بازار لاہور۔ 0331-4135212
- ☆ مکتبہ بزم اسلام، عطر مرکز 21-G، گوہر سنٹر، وحدت روڈ، نزد مسلم ٹاؤن لاہور 042-35912613 , 0322-4176513
- ☆ علم و عرفان پبلشرز، الحمد مارکیٹ، 40 اردو بازار لاہور 37352332 , 042-37232336
- ☆ مکتبہ الحرمین، الحمد مارکیٹ، اردو بازار لاہور 0321-4399313 , 042-37248013
- ☆ مکتبہ سید احمد شہید، اردو بازار لاہور 042-37228196

دارالمصنف پبلشرز کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں ان کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرمادیں۔ ان شاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائے گا۔ (ناشر)

انتساب...!

اپنے والدِ محترم جناب محمد جمیل چوہان اور والدہ محترمہ بلقیس کوثر کے نام...!

جہاں والدِ گرامی تیز دھوپ جیسے ہیں وہیں والدہ محترمہ گھنی چھاؤں جیسی۔ زندگی کو
زندگی کے لیے گھنی چھاؤں کے ساتھ ساتھ تیز دھوپ بھی درکار ہوتی ہے۔
اللہ تبارک و تعالیٰ اُن دونوں کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔ آمین

پیش لفظ

”زندگی کے بعد... موت سے پہلے“ میری دوسری کتاب ہے جو کہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے میں ”بلال صاحب“ ناول لکھ چکا ہوں۔

پاکستان میں دو طرح کا ادب رائج ہے۔ پہلا ادب برائے ادب... جو ہمارے درسی نصاب میں پڑھایا جاتا ہے اور دوسرا ادب برائے اصلاح... جو کہ پڑھایا تو نہیں جاتا مگر عوام اُسے زیادہ پڑھتی ہے۔ میں نے ان دونوں طرح کے لکھنے والوں کو پڑھا ہے۔ مجھ سے کئی بار سوال کیا گیا کہ میں کس طرح کے لوگوں کے حق میں ہوں اور میرے نزدیک صحیح ادب کون سا ہے؟

صحیح اور غلط ادب کا احاطہ تو میرے جیسا عام سا لکھنے والا نہیں کر سکتا ہاں اس بارے میں میری ایک رائے ضرور ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہانی اور کردار آپ کے ارد گرد معاشرے میں ہی ہوتے ہیں، انھیں سوچنے کی بجائے دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اگر لکھنے والے کرداروں کو سوچیں گے پھر یہ بحث رہے گی۔ اگر وہ کرداروں کو دیکھ کر لکھ دیں گے جو ہے جیسا ہے کے اصول پر پھر یہ بحث ختم ہو جائے گی۔ کردار خود ہی میں اچھائی اور بُرائی کا مجموعہ ہوتا ہے اور ہر کہانی اپنے اندر ادب کے ساتھ ساتھ اصلاح کا پیکر بھی لیے ہوتی ہے۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے، اس کتاب میں ایسی ہی دس کہانیاں ہیں۔

ہر انسان کی زندگی میں ایک ایسا وقت ضرور آتا ہے جب وہ اپنی زندگی جی چکا ہوتا ہے اور موت اُس کی دہلیز پر کھڑی ہوتی ہے۔ اُس وقت کی مدت مختلف ہو سکتی ہے۔ کبھی چند مہینوں، ہفتوں، دنوں، گھنٹوں اور کبھی کبھی تو چند لمحوں کی کہانی ہوتی ہے۔ ایسی ہی بیش تر کہانیاں اس کتاب میں شامل ہیں۔

میں اُمید کرتا ہوں ”بلال صاحب“ کی طرح میری یہ کوشش بھی میرے پڑھنے والوں کو ضرور پسند آئے گی۔ بہت ساری ایسی شخصیات ہیں جن کا میں مشکور ہوں۔

محترمہ بانو قدسیہ آپا اُنہی میں سے ایک ہیں۔ اُنہوں نے میری ہمیشہ حوصلہ افزائی کی اور مجھے لکھنے کی ترغیب دی۔

پروفیسر سید اسرار بخاری، آپ مشہور صحافی ہیں اور جنگ اخبار میں کالم بھی لکھتے ہیں۔ میرے نزدیک بخاری صاحب ایک درویش صفت انسان ہیں۔ آخر میں اپنے اُستاد محترم حکیم محمد حنیف صاحب کا ذکر کرتا ہوں جو کہ شہر اقبال کے مشہور حکیم اور دانش ور ہیں۔

ان تمام قابلِ احترام شخصیات کی مجلس میں بیٹھنے سے سیکھنے کو بہت کچھ ملتا ہے۔ چند ایسے افراد بھی ہیں جو میرے لیے آکسیجن کا کام کرتے ہیں۔ اُن میں خالد محمود بٹ صاحب جو کہ فلم اور ٹی وی کے مشہور کیمرہ مین ہیں۔ میرے دوست محمد طاہر اعوان اور محمد جمیل ملک۔ ان سب کا بھی میں تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

شکیل احمد چوہان
آپ کی قیمتی آراء کا منتظر

shakeelahmedchohan1@gmail.com

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
1	ف	8
2	حرا کا حجاب	16
3	مولوی سلامو کا کچا کوٹھا	25
4	مائی چیمبی کا فیصلہ	33
5	دل کے قصے میں	43
6	اکلوتا	53
7	جامین	62
8	تقریباً پونے گیارہ بجے	71
9	زندگی کے بعد... موت سے پہلے	82
10	میم	110

ف

”ف سے فرض..... ف سے فائدہ..... ف سے فلک..... ف سے فیصلہ..... جی ہاں.....! فیصلہ غلط اور سہی کا..... اچھائی اور برائی کا..... حیا اور بے حیائی کا۔“ فاطمہ لغاری نے اپنی چادر اتارتے ہوئے کہا، پسینے کی وجہ سے اُس کے سر کے بال گیلے تھے۔

”ف سے فکر ہے تمھاری..... یہ لولیموں پانی پیو۔“ فریحہ شیرازی نے شیشے کا گلاس فاطمہ لغاری کی طرف بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

”فاطمہ پی لو..... فری ماڈل صرف لیموں پانی ہی پلاتی ہے۔“ فضیلہ فہد نے کرلیے چھلپتے ہوئے کہا۔

”آج رات کو تیرے لیے Bear لے کر آؤں گی۔ فاطمہ.....! اس سالی کا پینے کو دل کرتا ہے، تیرے ڈر کی وجہ سے نہیں پیتی۔“ فریحہ مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئی۔

فاطمہ لغاری، فریحہ شیرازی اور فضیلہ فہد میں صرف ایک قدر مشترک تھی کہ وہ تینوں اپنے اپنے گھروں سے بھاگ کر کراچی پہنچی تھیں۔

فاطمہ لغاری اس لیے گھر سے بھاگی تھی کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ قرآن کی حافظہ تھی۔ اُس کے گھر والے قرآن ہی سے اُس کا نکاح کرنا چاہتے تھے، صرف زمین کے چند مربعوں کے لیے۔ اس کے برعکس فضیلہ گھر سے بھاگی تھی فہد سے شادی کرنے کے لیے۔ شادی تو ہوگئی فہد سے لیکن فہد اس کے نصیب

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

میں نہیں تھا۔ فضیلہ اپنی محبت کی آرتی اتارتی رہی اور فہد فضیلہ کی.....

فاطمہ شادی سے بھاگی اور فضیلہ شادی کے لیے بھاگی۔ فریحہ شیرازی فلم کے لیے بھاگی۔ وہ فلم ایکٹریس بننا چاہتی تھی، وہ فلم سے فیم چاہتی تھی۔

”جو اللہ سے نہیں ڈرتا اُسے سب سے ڈرنا پڑتا ہے..... اللہ سے ڈرنے والے کا خوف دور ہو جاتا ہے۔“ فاطمہ کرسی پر فضیلہ اور فریحہ کے سامنے بیٹھ گئی ان کے درمیان پلاسٹک کی میز تھی۔

”میرا بوائے فرینڈ فیصل خان کہتا ہے کلفٹن میں میرے فلیٹ میں شفٹ ہو جاؤ پر تم دونوں سے دور جانے کو دل نہیں چاہتا۔“ فریحہ نے Gold Leaf Light سگریٹ سلگاتے ہوئے اسٹائل سے کہا جیسے اُس نے فاطمہ کی بات سنی ہی نہ ہو۔

”نواد سے فرحان اور اب فیصل۔“ فضیلہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”دو ماہ کے اندر یہ تیرا تیسرا بوائے فرینڈ ہے۔“ فاطمہ نے منہ میں لاحول ولاقوۃ پڑھا اور افسوس سے گردن ہلائی۔

”یہ لڑکے تیرے ساتھ مزے کرتے ہیں پھر تجھے چھوڑ دیتے ہیں۔“ فضیلہ نے کرب میں ڈوبی ہوئی آواز سے فریحہ کی طرف دیکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

فریحہ کے چہرے پر مسکراہٹ اُبھری۔ اُس نے سگریٹ کا لمبا کش لگایا ناک اور منہ سے دھواں آزاد کیا۔

”فوزی جانوں..... مزے تو میں کر رہی ہوں، وہی مزے جو تیرا بے غیرت فہد تیرے ساتھ چھ مہینے تک کرتا رہا۔ یہ سالے مرد سمجھتے کیا ہیں..... یہ مرد، عورت کے جسم سے کھیلنے ہیں میں ان کے جسموں کو جہنم میں لے کر جاؤں گی۔“

”کیا اسکور کر چکی ہو اب تک؟“ فضیلہ نے تجسس سے پوچھا۔

”گیارہ!“

”گیارہ؟“ فضیلہ نے فریحہ کے جواب کو دہرایا۔

”ان میں سے تین چھکے تھے۔“ فریحہ نے سگریٹ کو الیش ٹرے کے حوالے کیا۔

”چھکے مطلب؟“ فضیلہ نے پھر جلدی سے پوچھا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

فاطمہ یہ سن کر وہاں سے غصے میں اٹھی اور وضو کرنے چلی گئی۔ عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ فاطمہ ایک دین دار لڑکی تھی، فضیلہ دین اور دنیا کے درمیان سینڈوچ بنی ہوئی تھی۔ فریحہ کے لیے دنیا ہی سب کچھ تھی، وہ دنیا میں ہی جنت تلاش کر رہی تھی۔

”چھکے مطلب، دردِ سر، ان کو صرف باتوں کا شوق ہوتا ہے۔ بک بک سُن لو ان کی اردو انگلش کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ لفظ ایسے بولتے ہیں کہ الفاظ ٹوٹ نہ جائیں۔ نزاکت ہی نزاکت... چھکوں کے پاس جا کر درد کو آرام نہیں ملتا بلکہ درد بڑھ جاتا ہے۔“

”درد مطلب؟“ فضیلہ بھولی صورت بنا کر بولی۔

”مجھے تو لگتا ہے..... فہد بھی چھکا ہی تھا۔“ فریحہ نے جانچتی نگاہوں سے دیکھا فضیلہ کی طرف جس نے شرما کر گردن جھکا لی تھی۔

”نہیں تو..... وہ تو..... کریلے سے کڑوا..... شہد سے میٹھا تھا..... کبھی نیندیں بخر کر دیتا..... کبھی محبت کی زرخیز زمیں پر سلاتا..... وہ چھکا نہیں تھا وہ تو میرا چوکا تھا۔ جس نے چاروں شانے چت کر دیا مجھے۔“ فضیلہ، فریحہ کی آنکھوں میں دیکھ کر بول رہی تھی، چھری ٹرے میں پڑی تھی اور کریلا فضیلہ کے ہاتھ میں۔

”فاطمہ کے سامنے کتنی شریف بنتی ہو اندر سے پوری گھنی ہو۔ تم نے اپنا اسکور تو بتایا ہی نہیں؟“

”میں نے ایک ہی گیند کھیلی تھی جس پر میں نے چوکا لگایا..... میرا فہد میرا چوکا تھا۔“ فضیلہ کے ہونٹوں پر فہد کا لمس، آنکھوں میں فہد کی تصویر تھی اور اُس کی سانسیں فہد کی سانسوں سے معطر ہو چکی تھیں۔

فضیلہ کو اپنے گھر سے بھاگنے کا کبھی افسوس نہیں ہوا۔ وجہ اس کی سوتیلی ماں تھی، فہد اُس کا بچپن سے پڑوسی تھا۔ فہد نے فضیلہ کے لیے رشتہ بھیجا تھا پر فضیلہ کی سوتیلی ماں کے سامنے اس کے باپ کی نہ چل سکی۔ فضیلہ کا باپ فہد کے حق میں تھا۔

”فری ایک بات مانو گی میری؟“ فضیلہ نے سنجیدگی سے کہا۔ فریحہ نے اثبات میں سر کو جنبش دی پر فضیلہ کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے فریحہ کو تک رہی تھی۔ فریحہ کو فکر لاحق ہوئی۔ اس نے فضیلہ کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا جس ہاتھ میں کریلا تھا۔

”بولو فو زی..... کیا بات ہے..... میں مانوں گی۔“

”فری تم فہد کو گالیاں مت دیا کرو..... پلیز۔“ فضیلہ نے ایسے کہا جیسے وہ فریحہ سے آخری خواہش کا

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

اظہار کر رہی ہو۔ فریحہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری۔

فریحہ نے سگریٹ نکالا اور اسے آگ سے سزا دی جیسے اس کا بچپن غربت کی آگ میں جلا تھا، جب اس کا باپ چل بسا..... چار بہنوں میں تیسرا نمبر فریحہ کا تھا۔ ماں کو اپنی چار بیٹیوں کے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے ہر روز کسی نہ کسی کا بستر سجانا پڑتا۔ ماں کی ہڈیوں میں سے جوانی کا رس ختم ہوتا گیا۔ بیٹیوں کی کلیاں کھلتی گئیں۔ جب فریحہ کی باری آئی تو وہ گھر سے بھاگ آئی۔ فریحہ کا ماننا تھا کہ اگر مقدر میں بکنا ہی ہے تو اپنی قیمت بڑھا لو۔ قیمت بڑھانے کے لیے نام بنانا پڑتا ہے، نام بنانے کے لیے وہ فلم ایکٹریس بننا چاہتی تھی۔ فریحہ فلم ایکٹریس تو نہیں بن سکی البتہ ماڈل بن گئی، کئی کمرشلز وہ کر چکی تھی۔ امیر زادوں کی جیب سے پیسہ نکالنا اسے آتا تھا۔

”فاطمہ سے اس کا اسکور نہیں پوچھو گی؟“ فریحہ نے فضیلہ کے چہرے پر سنجیدگی دیکھ کر بات بدلی۔ فاطمہ عصر کی نماز پڑھ کر ان کی طرف واپس آرہی تھی۔

”اکیلا کھلاڑی کہاں اسکور بنا سکتا ہے۔“ فضیلہ نے فاطمہ کو دیکھ کر کہا۔

”شکر ہے تم دونوں کی بے ہودہ باتیں تو ختم ہوئیں۔“ فاطمہ نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ فریحہ اور فضیلہ نے ہنسنا شروع کر دیا۔

”فضیلہ نماز تو پڑھ لو..... ان کو کہنا تو فضول ہے۔“ فاطمہ نے فریحہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

فضیلہ نے سبزی والی ٹرے اٹھائی اور کچن کی طرف چل دی۔

”نماز پڑھ لو..... رات کا کھانا مت بنانا۔“ فریحہ کی آواز نے فضیلہ کا تعاقب کیا۔ فاطمہ اور فضیلہ ڈیڑھ سال سے فریحہ کے فلیٹ میں اس کے ساتھ رہ رہی تھیں۔

ڈیڑھ سال پہلے ریلوے اسٹیشن سے باہر آتے ہوئے فریحہ کی نظر فاطمہ پر پڑی جو مریل گائے کی طرح دم سادھے ہوئے ہوئے اسٹیشن سے باہر نکلی۔ فریحہ کو ایسی ہی گائے کی تلاش تھی جو اس کا خیال رکھے اس کی خدمت کرے صرف حکم مانے سوال نہ پوچھے۔ چوبیس گھنٹے اس کی جی حضوری میں لگی رہے۔

فاطمہ نے چند دن بعد فریحہ کو پوچھے بغیر ایک اسکول میں بچوں کو قرآن پڑھانے کی نوکری کر لی۔ اسی اسکول میں فہد چوکیدار تھا۔ فہد کے غائب ہونے کے بعد فضیلہ کو فاطمہ اپنے ساتھ لے آئی۔ فریحہ کے فلیٹ پر گھر کا سارا کام فضیلہ کرتی۔ فاطمہ نے گھر کے کچن کا خرچہ اٹھایا ہوا تھا۔ پچھلے ڈیڑھ سال کے دوران

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

فریحہ میں بہت تبدیلی آئی۔ پہلے فاطمہ اور فضیلہ کو وہ اپنی کنیریں سمجھتی تھی۔ اب بہنوں کی طرح چاہتی.....

”کھانا کیوں نہ بنائے؟“

”گرمی بہت ہے کلفٹن چلتے ہیں اس کے بعد کسی اچھے ریستورنٹ میں ڈنر کرواتی ہوں۔“

”تم فضیلہ کو لے جاؤ، میں نہیں جاسکتی۔“ فاطمہ نے حتمی بات کہہ دی۔

”فاطمہ تم میری سمجھ سے باہر ہو۔“ فریحہ نے ناراضی سے کہا۔

”آج میں ایک سچ بولنا چاہتی ہوں مگر میری ایک شرط بھی ہے۔“ فاطمہ نے ہاں میں ہاں ملکہوں کو جنبش

دی۔

”ڈیڑھ سال پہلے میں تمہیں اپنی خدمت کے لیے لائی تھی۔ مجھے تم جیسی لڑکی کی ضرورت تھی، جو گھر واپس نہ جائے باہر نہ نکلے، میری باتیں کسی سے نہ کرے، چند دن کے اندر ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ تم میرے رازوں کو راز رکھو گی، خدمت کی جگہ تم مجھ سے محبت کرنے لگی، میں جسے کنیر سمجھ رہی تھی وہ شہزادی نکلی، جب تم نے میری اجازت کے بغیر نوکری کر لی مجھے بہت غصہ آیا پھر تم مجھ سے پوچھے بغیر فضیلہ کو اپنے ساتھ لے آئی فضیلہ میری سوچ سے بڑھ کر تھی۔ چند دن بعد مجھے لگا کہ تم چلی جاؤ گی جب میں نے نشے کی حالت میں تم سے بدتمیزی کی تھی۔“

فریحہ بات کرتے کرتے رک گئی۔ سگریٹ سلگ سلگ کر انتقال کر چکا تھا۔ فریحہ نے دوسرا سگریٹ پیکٹ سے نکالا اس سے پہلے وہ اسے جلاتی فاطمہ نے سگریٹ پکڑا اور واپس لٹا دیا پیکٹ کے اندر۔

”مجھے معاف کر دو فاطمہ!“ فریحہ نے نظریں جھکا کر کہا۔ فاطمہ مسکراتے ہوئے بولی:

”اب اپنی شرط بتاؤ؟“

”شرط یہ ہے کہ... آج تم اپنے بارے میں مجھے سب کچھ سچ بتاؤ گی۔“

”سچ.....! وہ سچ جو ہم لکھتے ہیں، پڑھتے ہیں، صرف بولتے نہیں ہیں۔ میرا باپ ایک بہت بڑا زمیندار تھا۔ ابا اور تایا کی زمین اکٹھی تھی، میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہوں۔ لوگ کہتے ہیں میرے تایا نے خود میرے والدین کا ایکسیڈنٹ کروایا تھا۔“ فاطمہ نے اپنے اشکوں کو رخساروں سے مٹایا۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر بولی:

”میرا تایا میری شادی قرآن سے کروا کر ساری جائیداد اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ مجھے جائیداد نہیں

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

آزادی چاہیے تھی۔ گھر سے بھاگنے میں میرے ابا کے ایک وفادار ملازم اور اس کی بیوی نے میری مدد کی۔“
فاطمہ پھر تھوڑی دیر خاموش رہی گردن جھکائے فریجہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اب فریجہ نے بولنا شروع کیا۔

”کوئی دولت پانے کے لیے گھر سے بھاگتا ہے، تم دولت سے جان بچا کر گھر سے بھاگی۔ غربت مار دیتی ہے اور دولت جینے نہیں دیتی۔ صرف محبت زندہ رکھتی ہے۔ فضیلہ کو دیکھ لو اُس بے وفاء فہد کی محبت کے ساتھ زندہ ہے۔“

”فہد بے وفاء نہیں تھا بس زندگی نے اس سے وفاء نہیں کی۔“ فضیلہ بول رہی تھی فریجہ کے پیچھے کھڑی ہوئی۔ اس کے بعد وہ ٹیرس سے کمرے کے اندر چلی گئی، فریجہ کی نظریں فضیلہ کے ساتھ ساتھ کمرے تک گئیں۔

”فہد ایک بم بلاسٹ میں جاں بحق ہوا تھا۔ اسے فہیم صاحب نے اسکول کے کام کے لیے بازار بھیجا تھا، وہاں پر حادثہ پیش آ گیا۔“ فاطمہ نے باقی کہانی فریجہ کو سنائی۔

”فہیم صاحب نے مجھ سے کہا فضیلہ اور آپ کو میں کواٹر لے دیتا ہوں اس ماڈل کے ساتھ مت رہو وہ اچھی لڑکی نہیں ہے لیکن میں نے انکار کر دیا۔“
”کیوں؟“ فریجہ نے پوچھا۔

”تم کافر ہو..... منافق نہیں..... گناہ کو گناہ سمجھ کر کرتی ہو..... حلال اور حرام کی تمیز رکھتی ہو..... تمہارے باطن اور ظاہر میں کوئی فرق نہیں ہے..... میں نے تمہیں راتوں میں روتے دیکھا ہے۔ فریجہ میرے استاد فرمایا کرتے تھے:

”فاطمہ یاد رکھنا.....! لوہے کو لوہا کاٹ سکتا ہے..... غم کو غم دور کرتا ہے اور اللہ کی یاد میں آنسو بہانے سے آنسو رک سکتے ہیں۔ تمہارے جو آنسو تکیے پر گر رہے ہیں وہ آنسو اگر سجدے میں گریں جائے نماز کے اوپر تو تکیے پر بڑی پرسکون نیند آئے گی۔ تمہیں دونوں رستوں کی خبر ہے، غلط اور سہی..... فریجہ تم نے صرف ”ف“ سے فیصلہ کرنا ہے، سیدھے راستے پر چلنے کا۔ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے، تم فرائض ادا کرو پھر دیکھنا اللہ تمہیں فلک سے اونچا مقام عطا کرے گا۔“

فریجہ اپنی کرسی سے اٹھی اور جلدی سے فاطمہ کے ساتھ لپٹ گئی جو کہ اپنی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
فریحہ بلک کر رو رہی تھی۔ فضیلہ کمرے کے دروازے میں کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی فضیلہ آئی اور فریحہ
کی کمر سے لپٹ گئی۔

”تم دونوں یہ رونا بند کرو میں ایک خوشخبری سناتی ہوں۔“ فاطمہ نے فریحہ اور فضیلہ کو خود سے جدا
کیا۔

”فہیم صاحب نے مجھے نکاح کا پیغام بھجوایا تھا اور میں نے ہاں کہہ دی ہے۔ پرسوں رات کو عشاء کی
نماز کے بعد نکاح ہے۔“

”فہیم صاحب تو.....“ فضیلہ نے حیرت سے کہا۔

”اس رنڈو سے شادی کرو گی جو دو بچوں کا باپ بھی ہے تمہاری اور اس کی عمر میں.....“
”دس کا فرق ہے..... میں بائیس سال کی، فہیم صاحب بتیس سال کے۔“ فریحہ کی بات کو فاطمہ نے
مکمل کیا۔

”اس فیصلے کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟“ فریحہ نے اپنا چہرہ صاف کیا اور اپنے بکھرے بالوں کا جوڑا
بنایا۔

”فہیم صاحب شریف آدمی ہیں۔ ڈیڑھ سال ہو گیا ان کے اسکول میں نوکری کرتے ہوئے۔ انھوں
نے کبھی بری نظر سے نہیں دیکھا۔ اسکول کی دوسری ٹیچر زبھی ان کی شرافت کی گواہی دیتی ہیں۔“
”صرف فہیم کی شرافت کی وجہ سے اس سے شادی کر رہی ہو؟“ فریحہ نے خفگی سے کہا۔
”فاطمہ تم اچھے خاندان سے ہو، قرآن کی حافظہ ہو، انتہائی حسین ہو، میں تمہارے لیے کسی بڑے
خاندان سے لڑکا ڈھونڈتی ہوں جو تمہارے قابل ہوگا۔“

”سچ کہوں تو مجھے فہیم صاحب اچھے لگتے ہیں اور میری بھی خواہش تھی کہ میری اُن سے شادی ہو
جائے۔“ فاطمہ نے جواب دیا اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”فہیم صاحب واقعی بہت اچھے آدمی ہیں۔“ فضیلہ نے فاطمہ کی بات کی تائید کی۔

”مجھ کا فر کو مسلمان تو کرتی جاؤ۔“ فریحہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”فاطمہ تمہارے ساتھ ہوتی ہوں تو تم جیسی بننا چاہتی ہوں۔ جب شوٹ پر جاتی ہوں تو تمہاری
باتیں ہوا ہو جاتی ہیں..... یہ سالی گناہوں کی گٹھڑی سر سے اترتی ہی نہیں۔“

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”ایمان کی چادر سر پر اوڑھ لو گناہوں کی گٹھڑی خود بخود اتر جائے گی۔“ فاطمہ نے پیار سے فریحہ کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر جواب دیا۔

”تم دونوں جلدی سے تیار ہو جاؤ آج کا ڈنر میری طرف سے۔“ فاطمہ نے فریحہ اور فضیلہ سے کہا۔

”بہت ذہین ہو فاطمہ.....! میری کمائی کا ایک لقمہ نہیں کھایا اس ڈیڑھ سال میں۔ مجھ سے محبت کرتی ہو اور میری کمائی کو حرام بھی سمجھتی ہو۔“ فریحہ نے فاطمہ سے گلہ کیا۔

”کفر سے نفرت کرنی چاہیے..... کافر سے نہیں۔“ فاطمہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

مغرب کے بعد وہ تینوں اپنی بلڈنگ سے نکلی کلفٹن جانے کے لیے۔ ہفتے کی شام ہونے کی وجہ سے بازار میں بہت رونق تھی۔ فریحہ نے ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا اس سے پہلے وہ تینوں ٹیکسی میں سوار ہوئیں ایک زوردار دھماکا ہوا۔ دھماکا خود کش تھا، اس دھماکے میں تیرہ افراد جاں بحق ہوئے اور سترہ زخمی۔ تیرہ میں فاطمہ، فریحہ اور فضیلہ بھی شامل تھیں۔

اگلے دن بازار میں پھر سے رونق تھی۔ تیرہ قیمتی جانوں کے ضیاع سے بازار میں کسی کو ”ف“ سے فرق نہیں پڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

حرا کا حجاب

”ہر فکر کے پیچھے ایک حرا ہوتی ہے۔“

”پتا ہے امی جی...! ہر فکر کے پیچھے ایک حرا ہوتی ہے۔ ہر جلوت کے پیچھے ایک خلوت ہے۔ طاقت کا سرچشمہ علم ہے۔ عیاں کو بیان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ چار سنہری اصول میرے دادا محمد جمیل شاہ نے میرے باپ محمد نوید شاہ کو سکھائے تھے اور ابو کے انتقال کے بعد یہ آپ کی ڈیوٹی ٹھہری۔“

حرا نوید شاہ نے چڑتے ہوئے اپنی ماں شگفتہ بانو کو جواب دیا۔

”حرا بیٹی...! یاد تو میں کراتی ہوں تجھے غصہ کیوں آتا ہے...؟“ شگفتہ نے رات کی باسی روٹی اور

چائے کا کپ اپنے جہیز کے میز پر رکھا تھا۔

”چلو ناشتہ کر لو کالج سے دیر ہو رہی ہے۔“

حرا نے نوالہ منہ میں ڈالا اور گرم چائے کا گھونٹ لیا۔ گرم چائے نے زبان کو حرارت پہنچائی اور دل

کے شکوے زبان پر آ ہی گئے۔ دادا کہتے تھے:

”ہر فکر کے پیچھے حرا ہوتی ہے“ اور یہاں حرا کے آگے پیچھے غربت ہے، جلوت کا تو پتا نہیں۔ یہاں تو

خلوت ہی خلوت ہے۔ ہمیں کوئی رشتہ دار بلاتا نہیں اور خود ہماری طرف آتا نہیں۔ عیاں کو بیان کی ضرورت

نہیں۔ یہ خوب کہا تھا دادا جی نے ہماری غربت سب پر عیاں ہے۔ مجال ہے کوئی بیان کے بغیر سمجھ جائے...

تیسرا سنہری اصول تو بھول ہی گئی، طاقت کا سرچشمہ علم ہے۔ علم پڑھ پڑھ کر مجھے چشمہ لگ گیا،

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

طاقت نہیں ملی۔“

”حرا بیٹی...! تو ایسی بے ادبی کی باتیں مت کیا کر...!“ شگفتہ نے شفقت سے حرا کے بازو پر ہاتھ رکھا جو کہ اُس کے سامنے ہی بیٹھی تھی۔

”امی جی...! کسی کے سامنے اپنی غربت کا رونا رونے سے بہتر ہے اُس سے شکوہ کر لو جس کے سامنے سب کچھ ہے۔“

”پچھلے کچھ عرصے سے جو کام تم نے شروع کیا ہوا ہے، اُسے چھوڑ دو بیٹی...! ہم سید ہیں... اپنے خاندانی رُتبے کا ہی خیال کر لو۔“ شگفتہ نے حرا کو اُس کا مقام اور کام دونوں کی یاد دہانی کروائی، اُسے ڈرتا ہوا عزتی کا رسوائی کا۔

”اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی چھوٹی چھوٹی خواہشیں ہی پوری کر رہی ہوں۔ اس سے کسی کا کوئی نقصان تو نہیں ہوتا، اگر کچھ گناہ ہے بھی تو وہ صرف میری ذات پر ہے۔“ حرا نے اپنا بیگ پکڑا اور علامہ اقبال میڈیکل کالج کو روانہ ہو گئی۔

حرا علامہ اقبال میڈیکل کالج میں ایم بی بی ایس کے فائنل ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ حرا نوید چار بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ بچپن میں ہی اس کا باپ ایک ایکسڈینٹ میں فوت ہو گیا، ماں سلائی کا کام جانتی تھی۔ اپنے جہیز کی سلائی مشین نکالی اور زندگی کا پہیہ چل پڑا۔

حرا شروع ہی سے پڑھنے میں لائق تھی، حرا نے اپنی حسرتوں کا رس نچوڑ نچوڑ کر اپنے قلم میں سیاہی ڈالی... چھوٹے بہن بھائی بھی اُس کی دیکھا دیکھی قناعت شعار، پڑھنے میں لائق اور روشن ضمیر بنتے گئے شگفتہ کو زیادہ سرکھپانا نہیں پڑا اپنے بچوں کے ساتھ ان تمام خوبیوں کے باوجود وہ تھے تو بچے ہی۔ اُن کی کچھ معصوم سی آرزویں ہوتی جو حرا پوری کر دیتی تھی۔ حالاں کہ اُسے وہ سب کچھ کرنا قسطی پسند نہیں تھا، پھر بھی وہ کر رہی تھی۔ حرا اپنی کلاس میں حجاب کرتی تھی، چہرے پر نقاب ہوتا اور پورے جسم پر برقعہ۔ بارہ مہینے پاؤں میں جو گر شوز پہنتی۔ کسی نے پوچھا ایسا کیوں...؟ حرا بولی: میرے پیروں میں درد رہتا ہے ڈاکٹر نے تجیسٹ کیا تھا۔ کندھے پر لیدر کا ایک کالابگ ہوتا جو کہ اُس نے ٹاؤن شپ کی لنڈا مارکیٹ سے خریدا تھا۔

کالج پیدل جاتی، وجہ کالج اُس کے گھر کے پاس ہی تھا۔ وہ (شاہ دی کھوئی) کی مکین تھی۔ اپنی کلاس میں سب سے الگ تھلگ رہتی۔ کوئی دوست نہیں تھا اُس کا۔ اپنی کلاس کی سب سے لائق اسٹوڈنٹ تھی۔ کالج

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

میں فارغ وقت جناح ہسپتال اور علامہ اقبال میڈیکل کالج کے OVAL گراؤنڈ کے درمیان واقع کینٹین جو کہ شاہین مال کے نام سے مشہور تھی وہاں پائی جاتی مگر اکیلی۔ ہاتھ میں کتاب ہوتی کبھی کبھار کینٹین سے چائے پی لیتی۔ اکثر اپنی نظریں کتاب پر جمائے رکھتی ارد گرد سے بے نیاز۔ کالج کے پہلے سال اُس کے کلاس فیلوز نے اُس سے دوستی کی کوشش کی تھی، اب چار سال بعد سب کو اُس کی عادت کا اندازہ ہو گیا تھا۔

اب اُس کے کلاس فیلوز جانتے تھے کہ اگر وہ حرا کے پاس بیٹھے تو وہ اُٹھ کر چلی جائے گی۔ سوائے ایک کے اور وہ میں تھا۔ حرا اکثر شاہین مال سے OVAL گراؤنڈ کی طرف جاتی ہوئی دو راہداریوں میں سے ایک میں بیٹھی ہوتی۔ جہاں پر وہ بہت ساری نظروں سے محفوظ رہتی کیوں کہ وہ جگہ دو عمارتوں کے درمیان تھی۔ OVAL گراؤنڈ کا ڈریسنگ روم اور شاہین مال کی مارکیٹ کی عمارتوں کی پشتیں آپس میں جڑی ہوئی تھیں۔ اُن کے درمیان سے اسٹیڈیم کی طرف دو راستے نکلتے، جن میں سے کوئی ایک حرا کا ٹھکانہ ہوتا تھا۔

”حرا بابی...! برگر بہت مزیدار ہے۔“ حیا نے برگر کھاتے ہوئے حرا کو مخاطب کیا۔

”میرا سینڈوچ زیادہ اچھا ہے۔“ جویریہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔

”نہیں جی...! میرا تیلے والا سموسہ سب سے زیادہ تیزی سے“ جاسم نے تو تلی زبان میں فیصلہ سنایا۔

حرا کے بہن بھائی رات کو کھانے کی بجائے اُس کی لائی ہوئی چیزوں کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

”اب تم سب دانت صاف کرو اور اپنے اپنے بستروں میں گھس جاؤ۔“ حرا اپنی کتاب پر نظریں جمائے ہی کہہ رہی تھی۔

حرا کے تینوں بہن بھائی سو چکے تھے۔ رات کے دوسرے پہر شگفتہ بانو کی آنکھ کھلی تو حرا پڑھ رہی تھی۔

”تمہیں نیند کیوں نہیں آتی... پہلے اپنے کالج جاتی ہو... پھر پتا نہیں کہاں کہاں پڑھانے جاتی ہو... پھر ٹیوشن والے بچے آجاتے ہیں۔ اُس کے بعد اپنی موٹی موٹی کتابیں لے کر بیٹھ جاتی ہو... سو جاؤ حرا بیٹی سو جاؤ...!“

”امی جی...! خواب نیندیں اُڑا دیتے ہیں، خواب سو کر پورے نہیں ہوتے اور میرا خواب اس ملک کی بڑی ہارٹ سرجن بننا ہے۔“

”تیری ساری باتیں ٹھیک ہیں سوائے ایک کے، بیٹی...! یہ کام چھوڑ دے جو تو کرتی ہے، اگر کسی

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

نے دیکھ لیا تو۔“ شگفتہ نے پھر حرا کو سمجھایا تھا، اُس کی ”تو“ میں بہت کچھ چھپا ہوا تھا۔

”تو کیا...! بتائیں؟“ حرا تیکھے انداز میں بولی جیسی آواز کے ساتھ۔

”ہر بات سوال نہیں ہوتی اور نہ ہی ہر بات کا جواب ہوتا ہے۔ بس یہ جان لو اس معاشرے میں بد

سے بدنام بُرا ہے۔“

”امی جی...! میں میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ آپ میرے ساتھ معرفت کی باتیں شروع کر دیتی

ہیں۔“

”جسے معرفت مل جائے وہ معروف ہو جاتا ہے۔“ شگفتہ بانو نے اپنا لحاف ہٹایا اور وضو کرنے چلی

گئی۔ جب وہ وضو کر کے واپس لوٹی حرا جواب سوچ کر تیار بیٹھی تھی۔ فوراً بولی:

”امی جی...! ایسی مشہوری کا کیا کرنا جس سے مشکلیں اور غم ہی دور نہ ہوں۔“

”غم سے جنم ہے...! اور جنم سے غم...!“ شگفتہ بانو نے یہ کہا اور تہجد کے لیے اپنے مصلیٰ بچھایا اور

اپنے مالک کے حضور کھڑی ہو گئی۔ شگفتہ نے سلام پھیرا ہی تھا حرا فوراً بول پڑی:

”امی جی...! دُعا کریں آج میرا آخری پیپر ہے، اُس کے بعد ہاؤس جاب بس سال ڈیڑھ سال کی

بات ہے پھر ان شاء اللہ سرکٹ چل جائے گا۔ میں آگے پڑھوں گی بھی اور جاب بھی کروں گی۔“

حرا کا آخری پیپر بھی بہت شان دار ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اگر

میں وہاں ہوتا تو ایسا کبھی نہ ہونے دیتا۔ میں پیپر دے کر وہاں سے نکل گیا تھا۔

حرا پیپر سے فارغ ہونے کے بعد حسب معمول کینٹین میں بیٹھی ہوئی تھی جب عروج داؤد وہاں

پہنچی۔ عروج داؤد ہماری کلاس کی دوسری لائق اسٹوڈنٹ تھی۔ اُس کی ہزار کوشش کے باوجود وہ حرا کو بیٹ نہیں

کر سکی۔ عروج داؤد کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی تھی۔ عروج اور جواد جا کر حرا کے پاس بیٹھے ہی تھے، حرا نے

اپنے شولڈر بیگ میں اپنا سامان ڈالا اور وہاں سے اٹھ گئی۔

”حرا رُکو...!“ عروج داؤد غیض و غضب سے چلائی۔ حرا رُک گئی۔ عروج لپکی حرا کی طرف اور اس

کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

”میرا موبائل کہاں ہے...؟“ عروج نے ٹٹولتی نظروں سے صدا لگائی۔

”کون سا موبائل...؟“ حرا جیسی آواز میں بولی۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
”وہ جو تمہارے بیگ میں ہے، دیکھو حرا!...! میرا ٹپر پچر ہائی مت کرو۔ شرافت سے میرا موبائل نکال دو۔“ عروج کے لہجے میں کڑواہٹ تھی۔

”عروج! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرے پاس تمہارا موبائل نہیں ہے۔“ حرا نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”غلط فہمی کیسی...؟ میں گاڑی میں بیٹھی تھی گھر جانے کے لیے۔ جواد نے کہا چلو کیٹینین سے چائے پیتے ہیں۔ میں نے ٹیبل پر موبائل رکھا ہی تھا کہ تم نے اٹھا کر اپنے بیگ میں ڈال لیا۔“
عروج کی گھن گرج سے ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ جن میں علامہ اقبال میڈیکل کالج کے کافی سارے اسٹوڈنٹس بھی تھے اس کے علاوہ مارکیٹ کے افراد بھی شامل تھے۔
”یہ جھوٹ ہے!...!“ حرا نے مختصر سا جواب ہے۔

”اچھا جی!...! چوری تم کرو اور جھوٹی میں۔“ عروج نے طنز سے کہا۔
”دیکھو عروج!...! میں تمہیں جھوٹا نہیں کہہ رہی، میں تو صرف یہ کہہ رہی ہوں میں نے تمہارا موبائل نہیں اٹھایا۔“ حرا نے پھر سے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

”میں گواہی دیتا ہوں عروج کی نظریں کبھی دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔“ جواد نے بات کو ہوا دی۔
”جواد اور جواز میں فرق رہنا چاہیے۔ بالکل اسی طرح جس طرح دلیل اور ذلیل میں، تم لوگ بغیر دلیل کے مجھے ذلیل کر رہے ہو اور جہاں تک دھوکے کی بات ہے، عروج ہی دھوکہ دیتی ہے حرا نہیں۔“
”ڈاکٹر حرا ڈاکٹروں والی باتیں کرو اور شیکسپیر کو کم پڑھا کرو۔ ڈرامہ چھوڑو اور موبائل واپس کر دو۔“
اس بار نیلم بولی۔

”تم لوگوں کو شرم آنی چاہیے مجھ پر الزام لگاتے ہوئے، چار سال سے ہم اکٹھے پڑھ رہے ہیں۔ میں نے کبھی کسی سے بال پین تک نہیں مانگا اور تم سب چوری کا الزام لگا رہے ہو مجھ پر، ہٹو آگے سے!“ اس بار حرا کی آواز میں قدرے ناراضی تھی۔

”تو تم اپنے بیگ کی تلاشی دے دو۔“ جواد نے قدرے غصے سے کہا۔
”میں اپنے بیگ کی تلاشی نہیں دوں گی۔“ حرا نے دو ٹوک کہہ دیا۔
”چور کی داڑھی میں تنکا۔“ نیلم نے پھر سے کہا جو کہ عروج کی بیسٹ فرینڈ تھی۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
 ”اگر میں چور نہ ہوئی تو... بولو ڈاکٹر نیلم...! پھر تم تینوں کو مجھ پر جھوٹا الزام لگانے کی کیا سزا ملنی چاہیے؟“ حرا نے نیلم کو کھری کھری سنائیں۔

”تم ثابت کر دو کہ تم چور نہیں ہو۔“ جواد نے پھر سے عروج کی نظروں میں ہیرو بننے کی کوشش کی۔
 کافی دیر بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ حرا اپنے بیگ کی تلاشی دینے کو تیار نہیں تھی۔ شریف چاچا سمو سے والا

بولا:

”حرا بیٹی...! میں بھی یہی کہوں گا تم اپنے بیگ کی تلاشی دے دو۔“ شریف چاچا سمو سے والا جس کی سب مارکیٹ والے عزت کرتے تھے اور سارے طالب علم بھی۔ وجہ وہ اس مارکیٹ کا سب سے پُرانا اور بزرگ آدمی تھا۔

حرا نے اپنا بیگ ہارے ہوئے سپاہی کی طرح کندھے سے اتار کر لوہے کی میز پر رکھ دیا تھا، بالکل ویسے ہی جیسے ہاری ہوئی فوج کے سپاہی اپنے ہتھیار دشمن کے سامنے ڈال دیتے ہیں۔

نیلم نے جلدی سے حرا کے بیگ کی زیپ کھولی اور اُسے ٹیبل پر الٹ دیا۔ لوہے کی میز پر ایک THERMOMETER, STETHOSCOPE چند بال پین، ایک پینسل، ریزر، اسکیل، ایک کوری کاپی اور ایک کالا شاپر بیگ پڑا ہوا تھا۔ یہ سب دیکھ کر ثاقب میرے دوست نے اُسی وقت مجھے موبائل پر اطلاع دی۔ میں نے بائیک واپس موڑ دی تھی کالج کی طرف۔

”دیکھنا...! موبائل اسی شاپر بیگ میں ہے۔“ عروج داؤد نے فاتحانہ انداز میں کہا تھا۔

چاچا شریف نے وہ شاپر بیگ کھولا۔ جس کے اندر کاپی کے کورے کاغذوں میں لپٹے ہوئے تین پیکٹ تھے، سب کی نظریں اُن تین پیکٹوں پر جمی ہوئی تھیں۔ چاچا شریف کے بوڑھے لرزتے ہوئے ہاتھوں نے پہلا کاپی کا کاغذ کھولا تو اُس میں اُس کے ہاتھ کے بنے ہوئے ڈھائی سمو سے تھے۔ دوسرے کاغذ میں ڈیڑھ برگر اور تیسرے میں دو سینڈوچ تھے۔ حرا کی گھنٹہ بھر کی محنت رسوا ہو گئی۔ یہ سب کچھ اُس نے مختلف ٹیبلوں سے اکٹھا کیا تھا اپنے بہن بھائیوں کے لیے جو اُس کے کالج کے ساتھی بچا کر گئے تھے وہ چپکے سے اُنھیں اپنے بیگ میں ڈال لیتی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے کئی بار میں نے بھی حرا کو دیکھا تھا مگر میں خاموش رہا تھا۔ اسی کام سے حرا کی ماں بھی اُسے منع کرتی رہتی تھی۔

سارا ہجوم اندر کی کہانی سمجھ گیا تھا، گھسّر پھسّر شروع ہو گئی۔ ایک دوسرے کے کانوں میں کچھ چہروں پر

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
حیرت تھی اور کچھ کتابی چہرے مسکرا رہے تھے۔ چاچا شریف نے وہ سارا مال غنیمت آہستہ آہستہ حرا کے بیگ میں واپس ڈالا۔ چاچا شریف کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ حرا نظریں جھکائے کھڑی تھی بالکل ایک مجسمہ کی طرح۔
”میں قسم کھا کر کہتی ہوں موبائل اس نے برقعے کے اندر چھپایا ہے۔“ عروج داؤد کو ہار منظور نہیں تھی۔ وہ اس بار ہر حال میں حرا کو ہارنا چاہتی تھی۔

حرا نے برف کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں اٹھائیں اور عروج کی آنکھوں میں دہکتے ہوئے انگاروں کو دیکھا، انگاروں کی حدت سے حرا کی آنکھوں میں جی برف اشکوں کی صورت میں ٹپکنا شروع ہو گئی۔ حرا اپنی ماں کا ترکی برقعہ پہنے ہوئے تھی۔ برقعہ کی ساتھی رومالی پھٹ جانے کی وجہ سے وہ اس کی جگہ اسکارف (اسٹالر) استعمال کرتی تھی۔ اسکارف اس کے چہرے اور سر پر ہوتا، صرف حرا کی آنکھیں نظر آتیں۔ کالی سیاہ آنکھیں جو آنسوؤں سے بھیگ چکی تھیں۔

حرا نے آہستہ آہستہ چپ چاپ اپنے ترکی برقعہ کے موٹے موٹے بٹن کھولنا شروع کیے۔ حرا کے جسم سے کالے برقعے کا پردہ اٹھ چکا تھا۔ کالے پردے کے نیچے حرا ایک گرم سوٹ پہنے ہوئے تھی جس کے اوپر دو پیوند لگے ہوئے تھے۔ سویٹر اور جرسی کی مہربانی سے کچھ غربت کے نشان ننگا ہونے سے بچ گئے تھے۔ (پردہ عزت بھی چھپاتا ہے اور غربت بھی)۔

حرا کا پردہ اُترنے سے اس کی دونوں چیزیں نکلی ہو گئیں۔ حرا اپنے پیروں پر گھومی چکی کے پاؤں کی طرح اسی جگہ گردن جھکائے ہوئے۔ کچھ آنکھوں میں نمی تھی کچھ ہونٹوں پر زریب مسکراہٹ ابھری۔ حرا اس مجلس کی میز پر جوٹھری تھی۔ اس کے کپڑے اس کی غربت چھپانے میں ناکام ہو چکے تھے۔ صرف اسکارف کو کامیابی ملی کیوں کہ چہرے پر نقاب ابھی بھی باقی تھا۔

حرا نے اپنے دائیں ہاتھ سے اپنی بائیں کینٹی کے پاس لگی ہوئی پین کو چھوا ہی تھا اپنے چہرے کو بے نقاب کرنے کے لیے اُسی لمحے چاچا شریف چیخا زور سے...

”نا... نا... میری بچی...! ایسا مت کرو... دفع ہو جاؤ تم سب یہاں سے... بے حیاؤ دفع ہو جاؤ...!“
اُسی لمحے میں نے اپنی موٹر سائیکل عروج داؤد کی گاڑی کے ساتھ کھڑی کی۔ میں نے دیکھا چابی اسٹیرنگ کے نیچے لٹک رہی تھی اور عروج کا موبائل ساتھ والی سیٹ پر پڑا ہوا تھا۔ جس وقت جواد نے عروج کو چائے کے لیے کہا وہ جلدی سے گاڑی سے اُتری اور جواد کے ساتھ چل دی۔ عروج جواد میں بہت زیادہ

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

انٹرسٹ لیتی تھی۔

”عروج...! تمہارا موبائل...!“ میں بھاگتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔ اُس وقت سب لوگ نظریں جھکائے مڑ رہے تھے۔ سب نے حیرت سے میرے ہاتھ کی طرف دیکھا جس میں موبائل تھا۔

”یہ سارا تماشا عروج نے لگایا ہے۔“ ثاقب نے مجھے بتایا۔ میں نے قہر آلود نگاہوں سے عروج کی طرف دیکھا۔ چند آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

”چاچا شریف ہمیں کیوں ڈانٹ رہے ہیں۔“

”سارا قصور عروج کا ہے۔“

”حرا اتنی غریب ہے...؟“

”اُس نے کبھی اپنی غربت کا ذکر تو نہیں کیا۔“

”میں تو سمجھتی تھی کسی کھاتے پیتے گھر سے ہوگی۔“

”پر ہے تو سب سے لائق۔“

”اب سمجھ آئی وہ الگ الگ کیوں رہتی تھی۔“

”کیسے کیسوں کو میڈیکل کالج میں داخلہ مل جاتا ہے۔“ نیلم نے تحارت سے آخری جملہ بولا تھا۔

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں... تم جیسی کردار کی گندی لڑکیوں کو تو بالکل نہیں ملنا چاہیے۔“ میں نے

غصے سے کہا۔

”تو قیر...! اپنی حد میں رہو...! اپنی حیثیت دیکھ کر بات کیا کرو۔“ جواد نے مجھے دھمکی دی تھی۔

”تمہاری اور عروج کی اسٹوری سناؤں...؟ اور نیلم تمہاری ہسٹری سے بھی میں اچھی طرح واقف

ہوں۔ یہ لو اپنا موبائل...!“ میں نے عروج کے ہاتھ پر موبائل پٹخ دیا۔

اُن تینوں نے وہاں سے کھسکنے میں ہی عافیت جانی۔ چاچا شریف نے حرا کے سر پر ہاتھ رکھا اور اُس

کا برقعہ کرسی کی ٹیک سے اٹھا کر اُسے تھما دیا اور خود اپنے آنسو صاف کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ حرا نے اپنا

برقعہ پہنا اور خاموشی سے نظریں جھکا کر وہاں سے چلی گئی۔

میرا اور حرا کا رشتہ بھی عجیب تھا۔ اُس نے کبھی مجھے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا اور میری ہمت نہیں ہوئی

کہ اُس کو آنکھ بھر کر دیکھ لوں۔ اس کے باوجود ہم کبھی کبھی اکٹھے چائے پی لیتے تھے۔ حرا میری کلاس فیلو تھی اور

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
مجھ سے بہت لائق تھی۔ محمد نوید شاہ کی حرا نوید شاہ میری زندگی میں نوید بن کر آئی اور میری توقیر میں اضافہ کیا۔
آج وہ حرا توقیر شاہ کے نام سے جانی جاتی ہے جو کہ پاکستان کی مشہور ہارٹ سرجن ہے۔ وہ آج
بھی حجاب کرتی ہے۔ حرا مجھ سے اکثر کہتی ہے:

”ڈاکٹر صاحب...! عورت کا پردہ اُس کی عزت بھی بڑھاتا ہے اور اُس کی غربت بھی چھپاتا ہے۔“
حرا نے اپنے سارے کلاس فیلوز کو معاف کر دیا تھا مگر وہ اُن میں سے کسی کو نہیں ملتی۔

حرا کی زندگی کی کتاب میں وہ دن بک مارک ہے، زندگی کے پنے تو آگے بڑھتے رہے۔ بک
مارک وہیں ہے۔ کسی کی عزت کا حجاب کبھی نہیں اتارنا چاہیے۔ نہیں تو زندگی آگے بڑھ جاتی ہے بک مارک
وہیں رہتا ہے بالکل حرا کی طرح۔ حرا اُس دن کو بھول نہیں سکی آج تک۔ آج آٹھ سال بعد حرا نے اپنے
سارے خواب پورے کر لیے۔ اُس نے اپنا آبائی گھر نئے سرے سے تعمیر کروایا، اس سال میں اور حرا اس کی
امی کوچ پر لے کر گئے تھے۔ اس کے بہن بھائی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ حرا اب بڑی پرسکون نیند سوتی
ہے۔ ایک پرسنل بات بتاتا ہوں: ہو سکتا ہے آپ کو یقین نہ آئے میں نے حرا کا چہرہ پہلی بار اپنی شادی والی
رات کو دیکھا تھا۔ اُسی لمحے پہلی دفعہ حرا نے مجھ سے نظریں ملائی تھیں۔
حرا سچ میں حیا والی حرا ہے۔

☆.....☆.....☆

مولوی اسلامو کا کچا کوٹھا

”مولوی جی.....! چلائی کے پانڈے ختم ہو گئے، پر چوڑے کے تھان ختم نہ ہوئے (رسوئی کے برتن ختم ہو گئے پر پانی ٹپکنے والے مقام ختم نہ ہوئے)۔“ پروین نے غصے اور بیزاری سے کہا۔

”کچا کوٹھا ہی سہی اپنا تو ہے، تیرے بھائیوں کی طرح کرائے دار تھوڑی ہیں۔“ مولوی اسلام دین نے فخر سے جواب دیا جو کہ ڈھیلی چار پائی پر لیٹا ہوا تھا۔ پھٹا ہوا کھیس اُس کے اوپر تھا۔

”پھر وہی طعنے..... کرائے پر ہی سہی رہتے تو لاہور شہر میں ہیں۔ مولوی جی اس پنڈ کا نام کلخانہ نہیں..... خصماں نوں خانہ..... ہونا چاہیے تھا یا پھر کل کھانا..... جب بھی کھانے کو کچھ مانگا..... کل کھانا..... کلخانہ..... خصماں نوں خانہ۔“ پروین نے کرخت لہجے کے ساتھ حساب چلتا کر دیا۔

”شکر کر پیو.....! شکر کر..... کھا کے سوتی ہے..... کبھی ایسا نہیں ہوا کہ تو بھوکی سوئی ہو۔“ مولوی اسلامو نے اپنی چار پائی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ مولوی اسلامو پر چھت سے پانی ٹپکنا شروع ہو گیا اُس نے اپنی چار پائی کھسکائی..... پیو کی بتیسی نکل آئی تھی مولوی اسلامو کو دیکھ کر۔

”مولوی جی.....! اور کرو شکر..... شکر سے نہ تو پانی ٹپکنا بند ہوتا ہے اور نہ ہی خالی پیٹ بھرتا ہے۔ شکر ہے..... شکر نہیں کہ منہ میٹھا ہو جائے..... اب تو زبان سارے سواد ہی بھول گئی ہے..... کیا میٹھا..... کیا کھٹا..... سوچی کا حلوہ کھائے ہوئے صدیاں ہو گئیں، چوگی امر سدھو میں ہمارے گھر کے سامنے گندے نالے کے اوپر کھٹے آلو چھو لے ملتے ہیں۔ پارشید ہر روز گھر آتے ہوئے میرے لیے آلو چھو لے لے کر آتا

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

تھا۔ یہاں صرف آلو ہی آلو ہیں۔“

پیو کے منہ سے آلو سن کر مولوی اسلامو کو یاد آیا جب وہ صدیق آرائیں سے اپنی سیپ (اُجرت) کی گندم لینے گیا تو صدیق آرائیں نے آلوستے ہونے کی وجہ سے ایک من گندم کی جگہ ایک من آلو دے دیے۔

”مولوی صاحب! آپ کی مسجد کی کمیٹی بھی نالائق ہے، بھلا یہ بھی کوئی گل ہے۔ مربعوں والے بھی ایک من اور ہم ٹھیکے والے بھی ایک من گندم اور مونجی۔“ مولوی اسلامو خیال کی آنکھ سے صدیق آرائیں کو بولتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

”تو بھی شروع ہو جا... تیری کسر باقی تھی۔“ پیو کی آواز سن کر مولوی اسلامو کی خیال کی آنکھ بند ہو گئی۔ کمرے کے ایک کونے میں پڑی ہوئی آلوؤں کی بوری سے اُس کی آنکھیں ہٹ کر پیو کے چہرے پر جا ٹھہری تھیں۔

”تیری کسر باقی رہ گئی تھی۔“ پیو کی نظر اپنے دو سال کے بیٹے پر پڑی جس کے کھیس کے اوپر پانی ٹپک رہا تھا۔

”ہفتے میں تین دن تو ہم لوگ شورے والے آلو کھاتے ہیں، تین دن لسی کی کڑی، ساتواں دن دال کا ہوتا ہے، گوشت عید کے عید وہ بھی کوئی دے گیا تو ٹھیک ورنہ منہ تکتے رہو۔“

پروین نے اپنے بیٹے کو چھاتی سے لگاتے ہوئے دوسری چار پائی پر لٹایا تھا۔ کڑی بنانے کے لیے لسی جانی گجر کے گھر سے مل جاتی۔ دوپہر کو تنور کی روٹی کے ساتھ لسی میں نمک ڈال کر سالن کا کام لیا جاتا جو لسی بچ جاتی وہ رات میں کڑی بنانے کے کام آ جاتی تھی۔

بادل گرج رہے تھے اور کچے کوٹھے کے اندر مولوی اسلامو کا دل تڑپ رہا تھا اپنی غربت پر۔ ساون کی جھڑی تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ جمعرات کی جھڑی تھی کبھی ہلکی اور کبھی تیز رُک نہیں رہی تھی۔

”مولوی جی.....! یہ امامت شامت چھوڑو یہ کچا کوٹھا بچ دولا ہور چلتے ہیں وہاں پارشید آپ کو فیکٹری میں لگوا دے گا۔“

پیو نے مولوی اسلامو کی طرف دیکھ کر کہا جو اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کو تھامے ہوئے تھا۔ مولوی اسلامو کے جسم کا بایاں حصہ پولیو کی وجہ سے کمزور اور ٹیڑھا تھا۔ وہ چل تو سکتا تھا مگر لنگڑا کر جس کی وجہ

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

سے لوگ اُسے مولوی لنگڑا بھی کہتے، کچھ بدتمیز لونڈے مولوی ڈانسر بھی کہتے تھے۔

مولوی اسلام دین امام مسجد تھا، وہ بھی کلکنا نہ گاؤں کی جامع مسجد کا۔ پورا محلہ کھاتے پیتے لوگوں کا پھر بھی مولوی اسلام کو کاٹھا کچا ہی تھا۔

”چھوٹے چوہدری صاحب.....! نماز پڑھا کرو۔“ ایک دن مولوی صاحب نے چوہدری ظہور سے

کہا تھا۔

”مولوی تجھے کس کام کے لیے رکھا ہے، تو نمازیں پڑھ، بانگیں دے۔ یہ جو مسجد پر پچیس تیس لاکھ لگائے ہیں، سب محلے والوں نے، تو اس مسجد کا کرتا دھرتا ہے جو مرضی کر.....!“ چوہدری ظہور نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”مولوی جی.....! میں تم سے کچھ بک رہی ہوں، تم پتہ نہیں کہاں کھوئے ہو، چھوڑو یہ امامت کوئی کام شام کرو۔“ پیو نے سخت لہجے میں کہا۔ مولوی اسلام دین اپنے خیالوں میں گم تھا۔ مولوی نے پروین کی بات سن کر جواب دیا:

”امامت تو ویسے ہی چھوٹ جائے گی، ممبر خلیل ہاتھ میں فتویٰ لیے گھوم رہا ہے سارے پنڈ میں کہتا پھر رہا ہے معذور مولوی کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔“ مولوی اسلام دین نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”تو کیا ممبر خلیل تمھاری جگہ مولوی لگنا چاہتا ہے۔“ پیو نے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے فکر مندی سے پوچھا تھا۔

”وہ جامع مسجد میں مولوی نہیں لگ سکتا، وہ دوسرے فرقے کا بندہ ہے پر مجھے ضرور فارغ کروا دے گا۔“

”تم نے بھی مولوی جی.....! ہر ایک سے ویر (دشمنی) ڈالا ہوا ہے، بھلا کیا ضرورت تھی اسپیکر میں اُن کے فرقے کو گالیاں دینے کی۔“ پیو نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”کافر کو کافر نہ بولوں، مرتد ہو گئے ہیں دوسرے محلے والے، سب کچھ چھوڑ بیٹھے ہیں۔ ناختم نا نیاں ایک دم شودے کمینے کہیں کے۔“ مولوی اسلام چارپائی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ اُس کے چہرے پر غصہ نمایاں نظر آ رہا تھا وہ لنگڑاتے ہوئے اپنے کچے کوٹھے کے دروازے پر گیا، بارش زور و شور سے جاری تھی۔

”پھر کیا سوچا مولوی جی.....!“ پیو ہولے سے بولی رُک رُک کر۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
 ”پیو دماغ نہ کھا میرا، سو جا تجھے پتہ ہے میں کام نہیں کر سکتا ایک ہاتھ اور ٹانگ سے کام نہیں ہوتا
 ویسے بھی ابا گاؤں سے جانے نہیں دے گا۔“

”ابے کا کیا ہے، اپنا کوٹھا تو پکا کر لیا اور ہمارا چھوڑ دیا۔“ پیو شکوے کے انداز میں بولی۔
 ”نا ابا کیوں بناتا ہمارا کوٹھا تو نے ہانڈی جو وکھری کر لی اماں سے، دو ہی جی ہیں اماں اور ابا، پر تو
 انہیں بھی دیکھ نہ سکی۔“ مولوی اسلامو چار پائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”سلمیٰ نے بھی طلاق اس بڈھے اور بڈھی کی وجہ سے لی تھی۔ تمہارا ساتھ چھوڑ کر اچھی رہی ہے۔
 اب کاموکی میں رہتی ہے، گھر والا فروٹ کی ریڑھی لگاتا ہے۔ فروٹ کھا کر سوتی ہے، کیا ہوا اُس کا گھر والا
 پندرہ بیس سال بڑا ہے۔ میرے لیے بھی باگڑیاں سے مٹھو ویلڈر کا رشتہ آیا تھا پر میری مت ماری گئی تھی جو میں
 نے انکار کر دیا۔ بھابھی باوی نے بڑا سمجھایا: ”پیو دفعہ کر مولوی کو، مولوی ہے تو گورا چٹا پر تیرے نصیب کالے
 ہو جائیں گے کیا ہوا مٹھو ویلڈر کالے دوس ہے چار پیسے کماتا ہے جٹی چٹری سے پیٹ نہیں بھرتا۔“ پیو نے اپنے
 آنسو صاف کیے۔ مولوی اسلامو اٹھا اور پیو کے ساتھ بیٹھ گیا چار پائی پر اس کا ہاتھ پکڑ کر پیار سے بولا:
 ”دیکھ پیو.....! ہمارے حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔“

”مولوی جی.....! بیس من گندم اور بیس من مونجی سے حالات ٹھیک نہیں ہوتے۔“
 ”دو ہزار مہینہ بھی تو دیتے ہیں۔“ مولوی اسلامو نے یاد کرایا۔

”مولوی جی 2015ء میں دو ہزار مذاق لگتا ہے۔“ پیو نے دُکھی آواز میں کہا۔
 ”آج کھنڈی عیسائی کی بیوی ملی، بتا رہی تھی اب وہ لوگ بھی اپنے کچے مکان پکے بنانے والے
 ہیں۔ اس کے بعد سارے پنڈ میں ہمارا گھر کچا رہ جائے گا۔ تمہاری مسجد کی کمیٹی تیس لاکھ مسجد پر لگا سکتی ہے،
 اپنے امام کو تیس ہزار بھی نہیں دے سکتی کہ وہ اپنا کچا کمرہ ہی پکا کر لے۔“
 ”کمیٹی والے کہتے ہیں یہ مسجد کے پیسے ہیں اس میں سے نہیں دے سکتے۔“ مولوی اسلام دین نے
 تفصیل بتائی۔

”بھوکے ننگے تھوڑی ہیں اُس محلے والے، سارے پنڈ کے ننگڑے لوگ اُسی محلے میں رہتے ہیں، گھر
 پرتی (فی کس) دو ہزار بھی دیں تو ہمارا کچا کوٹھا پکا بن جائے گا۔“ پیو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔
 ”پر... دے کون.....؟ چھ مہینے بعد فصل پر گندم اور مونجی دیتے ہوئے موت پڑتی ہے، دو ہزار دے

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

دیں۔“ مولوی اسلام دین نے غصے سے کہا۔

”اللہ کی قسمیں.....! اگر میرا بازو اور ٹانگ ٹھیک ہوتے تو میں کب کا کوئی دوسرا کام کر لیتا۔“ یہ کہتے ہوئے مولوی اسلام دین کی آواز میں درد اور آنکھوں میں نمی تھی۔

”مولوی جی.....! مجھ سے پوچھو تو سارا قصور تم مولویوں کا ہی ہے، تیس سال پہلے تو تم پولیو کے قطرے نہ پی سکے اور اب اپنے بچوں کو بھی نہیں پینے دیتے۔ بکری، مرغی گواچنے (گم ہونے) کا اعلان مسجد میں کر دیتے ہو پر پولیو والوں کا اعلان نہیں کرتے۔“

پینو نے چار پائی سے اٹھتے ہوئے کہا پرات اٹھائی جو کہ پانی سے بھر چکی تھی۔ اُس نے دروازے میں کھڑے ہو کر پانی باہر پھینکا اور خالی پرات پانی ٹپکنے کی جگہ پر رکھ دی اور خود اپنے بیٹے کے ساتھ لیٹ گئی۔

”یہ اس مسجد والے مارتے پھرتے ہیں پولیو والوں کو، ہر جگہ تباہی مچا دی ہے اس فرقے نے اور بدنام ہم سارے مولوی ہوتے ہیں۔“ مولوی اسلام دین نے اپنے گھر کے پاس والی مسجد کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”مولوی جی.....! اللہ ایک، اُس کا رسول ایک، قرآن ایک، تم مولوی پھر بھی ایک نہیں ہوتے۔ ایک دوسرے کو کافر کہتے رہتے ہو۔ تمہیں پتہ ہے مولوی جی اس مسجد والا مولوی جنید وہ وڈی (بڑی) پگ والا اس عید پر سارے محلے میں گوشت دے کر گیا صرف ہمارے اور چاچے کے گھر گوشت نہیں دیا۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا تھا، کہہ رہا تھا یہ دو گھر مشرکوں کے ہیں شرک کرتے ہیں۔ بدعتی ہیں یہ لوگ..... دسویں فیل ہی سہی مجھے سمجھ نہیں آئی میں نے کون سا شرک کیا ہے اور یہ مولوی جنید ساتھ والی ماسی بتا رہی تھی کہ وہ دو تین جماعتیں ہی پڑھا ہوا ہے پھر بھی فتوے دیکھو مسلمانوں کو مشرک بنا رہا ہے۔“

”یہ سارا محلہ مرتد ہو گیا ہے، بے ادب گستاخ..... وہ اونچی مسجد والے وہ تو تھے ہی بھٹکے ہوئے گمراہ لوگ دین سے دور اب اس محلے کا بھی بیڑا غرق ہو گیا ہے۔“ مولوی اسلام دین کی آنکھوں میں انگارے تھے۔ وہ غربت کی آگ تھی یا تفرقے کی..... تھی آگ ہی۔

”اونچی مسجد والا حافظ اختر جب جی چاہتا ہے ہمارے مسلک کے بارے میں بکواس کرتا ہے۔ اُسے کوئی کچھ نہیں کہتا۔“ مولوی اسلام دین نے گھن گرج سے کہا، پھر جواب بھی خود ہی دے دیا۔

”وہ کہہ سکتا ہے..... اُس کے پیچھے کشمیریوں کا ہاتھ ہے..... ایک ہماری مسجد والے سب ڈرپوک،

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

بزدل کہیں کے..... ناخود حافظ اختر کو جواب دیتے ہیں نہ مجھے دینے دیتے ہیں۔“

”اوپچی مسجد والے حافظ اختر کو کیا دیتے ہیں؟“ پیو نے پوچھا۔

”ایک ایکڑ زمین دی ہے کاشت کرنے کے لیے..... شامی (چھ ماہ) پندرہ سے بیس ہزار کی فصل بیج

لیتا ہے خرچے نکال کر۔“ مولوی اسلام دین نے کرخت لہجے میں جواب دیا تھا۔

”اور اس مسجد والے اپنے مولوی کو کیا دیتے ہیں؟“

”چھ ہزار مہینہ..... پر اس مولوی کی پوری تنخواہ بچ جاتی ہے..... ساری تنخواہ بھکر اپنے گاؤں بھیج دیتا

ہے..... کھانا نمبردار کے گھر سے آ جاتا ہے۔“ مولوی اسلام دین نے رشک سے بتایا۔

”پر ہے تو بیوی بچوں سے دور ہی..... مولوی جی تم اور حافظ اختر ٹھیک ہو۔ اپنے بیوی بچوں کے

پاس اپنے پنڈ میں۔“ مولوی اسلام دین کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری اور کہنے لگا:

”حافظ اختر کے کیسے بچے..... ویسے دم درود کے خلاف بولتا ہے اور خود تعویذ لے کر آیا ہے اولاد

کے لیے..... پر رہے گا نا مراد ہی۔“

”نا..... نا مولوی جی..... ایسی باتیں نہیں کرتے..... اللہ اس کی بیوی کی بھی گود بھر دے..... اُس

بھاگن کو بھی اولاد کی خوشی نصیب ہو۔“ پیو نے دعا دی محبت سے..... خلوص سے..... اپنے بیٹے کا ماتھا چومتے

ہوئے۔

”ایک نمبر کا منافق ہے..... اور تم دعائیں دے رہی ہو۔“ مولوی اسلام دین نے سخت لہجے میں کہا۔

”مولوی جی.....! مجھے سمجھ نہیں آتی تم سب مولوی ایک دوسرے کے اتنے خلاف کیوں ہو..... سب

کے سب غریب چھ ہزار سے اوپر کسی کی تنخواہ نہیں اور دشمنی سات پشتوں تک کرتے ہو وہ بھی بغیر وجہ کے۔“

پیو نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ مولوی اسلام دین نے دیکھا تو حیرت سے پوچھا:

”کیا یاد آ گیا تجھے آدھی رات کو؟“

”پارشید کو جس دن اپنا بیٹہ لڑوانا ہوتا وہ صبح ہی بھا بھی باوی کو بول کر جاتا اسے کچھ کھانا مت.....

بھوکے بیٹے زیادہ لڑتے ہیں۔ وہی حال مولویوں کا ہے..... سارے فرقوں کے مولوی مرتے بھوکے ہیں پر

لڑنے سے باز نہیں آتے..... ایک دوسرے کو کافر، مرتد، مشرک، گستاخ سب کچھ کہہ ڈالتے ہیں..... تنخواہ کا

حساب لگاؤ تو سب کی چھ ہزار نکلے گی۔“

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”اب ایسی بات بھی نہیں ہے..... میرا دوست ہے قاری شبیر ساتھ والے گاؤں میں امام مسجد ہے..... اُسے ہر ماہ اجمل باجوہ سعودی عرب سے پورے آٹھ ہزار روپے اس کے اکاؤنٹ میں بھیجتا ہے۔“
مولوی اسلام دین نے تفاخر سے بتایا۔

”بڑی چھال (چھلانگ) ماری مولوی جی.....! چھ ہزار سے سیدھا آٹھ ہزار تک..... ہاں یاد آیا وہ تمہارے ویزے کا کیا بنا؟“ پپو نے طنز سے کہا۔

فٹے منہ حافظ عدیل تیرا اُس وقت سیاپا (مصیبت) ڈالا ہوا تھا..... مولوی صاحب جلدی سے اپنی تصویریں اور پاسپورٹ کی کاپی بھیج دو..... اب کہتا ہے مولوی صاحب داڑھی چھوٹی کروا کرنئی تصویریں بھیجو۔
یہاں پر مولویوں کی داڑھی چھوٹی چھوٹی ہوتی ہے۔“

”مولوی جی پاسپورٹ پر جو چار ہزار لگا ہے وہ میں نے بھابھی باوی سے ادھار پکڑا، اس فصل پر واپس دینے کا وعدہ ہے جس طرح بارشیں ہو رہی ہیں لگتا ہے چاول کی فصل ویسے ہی گل جائے گی۔ مولوی جی کہیں سیلاب ہی نہ آجائے۔“ پروین نے فکر مندی سے کہا۔

”اللہ کرے ہڑ (سیلاب) آجائے سب کی فصلیں بہہ جائیں۔ علامہ اقبال نے صحیح کہا تھا:

جس کھیت سے مولوی کو میسر نہ ہو گندم

اس کھیت کو بہا دو.....“

”مولوی جی اب شعر بھی غلط پڑھ رہے ہو۔“

”تو..... صحیح پڑھ دے پپو بیگم.....!“ مولوی اسلام دین نے طیش سے کہا۔

”اگر میں اس قابل ہوتی تو اس کلخانا پنڈ میں تمہارے ساتھ نہ ہوتی۔“

”تو کر لیتی مٹھو ویلڈر کے ساتھ شادی۔“ مولوی اسلام دین نے اپنی بیوی کو طعنہ دیا۔

مولوی اسلام دین دکنے میں بہت خوب صورت تھا۔ کالے سیاہ کیسو، سفید رنگت، نورانی چہرہ، اسی خوبصورتی کی وجہ ہی سے پروین نے مٹھو ویلڈر کی بجائے مولوی اسلام دین سے شادی کی تھی۔

”مولوی جی میں اپنے کامی کو مولوی کبھی نہیں بنے دوں گی۔“

”پپو..... پپو..... تجھے ہزار دفعہ کہا ہے کامی مت کہا کر اس کا نام کامران اسلام ہے پورا نام لیا

کر۔“

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”مولوی جی آپ جو پیو..... پیو کرتے رہتے ہو میرا نام بھی پروین سلطانہ ہے۔“

”تجھے تو شروع ہی سے تیرے گھر والے پیو کہتے ہیں۔“

”مولوی جی.....! تم تو پروین کہا کرو۔ تمہارا نام اسلام دین ہے سارے لوگ مولوی اسلامو کہتے ہیں کئی تو مولوی لنگڑا بھی کہتے ہیں۔ میری زبان جل جائے اگر مولوی جی کے علاوہ کبھی اس میں سے کچھ نکلا ہو۔“ پروین نے شکوہ کیا۔ مولوی اسلام دین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھری۔ اس نے پروین سے آنکھیں چار کیں۔

”پروین سلطانہ.....! غصہ تھوک دو، کامران سویا ہوا ہے تم آ جاؤ میری چار پائی پر۔“

پروین مسکراتے ہوئے مولوی اسلام دین کے ساتھ لیٹ گئی۔

اسلام دین اور پروین ڈھیلی چار پائی پر سیدھے لیٹ گئے چھت کی طرف منہ کر کے اور اپنے کچے کوٹھے کی ٹپکتی ہوئی چھت کو دیکھنے لگے۔ اُن دونوں کا غصہ وقتی طور پر ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ غصہ جو غربت کی وجہ سے اُن دونوں کی شخصیت کا حصہ بن گیا تھا۔

”اللہ بہتر کرے گا..... ان شاء اللہ اگلی برسات سے پہلے ہم اپنا کچا کوٹھا پکا بنالیں گے۔“ مولوی اسلام دین نے چھت سے ٹپکتے ہوئے پانی کو دیکھ کر پروین کو تسلی دی۔ تھوڑی دیر وہ دونوں بچوں کی طرح ایک دوسرے کو پانی ٹپکنے والے مقامات کی نشاندہی کرواتے رہے۔

”اب تم کامران کے ساتھ جا کر سو جاؤ۔“ مولوی اسلام دین نے کروٹ لیتے ہوئے کہا۔ پروین اٹھی اور اپنے بیٹے کے ساتھ جا کر سو گئی۔

رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ بارش ہلکی ہو چکی تھی۔ مولوی اسلام دین اور پروین کچے کوٹھے میں سو گئے۔ فجر کی اذان دینے کے لیے جب ہو میو پیتھک ڈاکٹر سعید چھتری لے کر گھر سے نکلا۔ مولوی اسلام دین کی گلی میں سے گزرتے ہوئے وہ زور سے چیخا..... چلایا..... کوٹھا گر گیا۔ مولوی اسلامو کا کوٹھا گر گیا..... گر گیا۔ ڈاکٹر سعید روتے ہوئے چیخ رہا تھا کہاں مر گئے ہو محلے والوں۔ مولوی اسلامو کا کچا کوٹھا گر گیا.....

مولوی اسلامو کا کچا کوٹھا.....

☆.....☆.....☆

مائی چیمی کا فیصلہ

”بڑے فیصلے انسان کو بڑا بناتے ہیں، کچھ ورکا پھل اور فیصلے کا ثمر دیر سے ملتا ہے، جب تک تم دونوں حق پر فیصلے کرتے رہو گے تمہارا ڈیرہ آباد رہے گا۔ پنچائیت میں نہ جھوٹ بولنا اور نہ ہی جھوٹے کی وکالت کرنا، پولیس کے سپاہی سے کبھی نہ بگاڑنا، تھانے دار آتے جاتے ہیں، سپاہی وہی رہتے ہیں۔ کچہری کے چکر لگا لگا کر بندے رُل جاتے ہیں۔ نگڑے سے نگڑا وکیل بھی پٹواری کے لکھے ہوئے کو مٹا نہیں سکتا، پٹواری پواڑہ (فساد) ڈالتا ہے، اُس سے بنا کر رکھنا۔“

1965ء میں دسمبر کے جاڑوں کی راتوں میں سے ایک رات مائی چیمی اپنے پوتوں امانت اور سلامت کو سمجھا رہی تھی زندگی کے گر... اور فیصلے کرنے کے اصول۔ امانت اور سلامت اپنی دادی کی باتیں سنتے سنتے سو گئے۔

”زہرہ بیٹی! ویروں (بھائیوں) پر رضائی اچھی طرح ڈال دو اور تم بھی سو جاؤ۔“ مائی چیمی نے لالٹین کو بجھاتے ہوئے اپنے بستر پر کمر سیدھی کی اپنا گول تکیہ ایک طرف رکھا اور سو گئی۔

مائی چیمی ایک بیوہ عورت، جس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ بیٹے اور بہو سے زیادہ اُسے اپنی بارہ سالہ پوتی زہرہ، دس سالہ امانت اور آٹھ سالہ سلامت زیادہ پیارے تھے۔ وہ اصل سے زیادہ سود سے محبت کرتی تھی۔ چانن پور گاؤں کے سارے فیصلے پچھلے اٹھارہ سالوں سے مائی چیمی کرتی آرہی تھی، اس کا ہر فیصلہ اپنی مثال آپ تھا۔ مائی چیمی بڑے سے بڑے کھڑپنچ کو آنا فانا اپنی دانائی سے زیر کر دیتی، وہ دھیرج سے

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

دونوں اطراف کی اول فول سنتی رہتی، مائی چیمبی کالب ولجہ اور طرزِ تکلم بلبل کی مانند میٹھی زبان میں ہوتا تھا۔

اگلی صبح ہی اس کے پاس گاؤں کی ایک بیٹی کا فیصلہ آ گیا جو پاس والے گاؤں میں بیاہی تھی اور ناراض ہو کر میکے میں بیٹھی تھی۔ لڑکے والے لڑکی کے گھر جانے کی بجائے مائی چیمبی کے ڈیرے پر آئے تھے۔

”بہن چیمبی آپ سے فیصلہ کروانا ہے۔“ رحمت جوئیہ نے کہا جو کہ شہباز جوئیہ کا تایا تھا۔

”اپنا پتر شہباز اپنی گھر والی کو وسانا (بسانا) چاہتا ہے پر کڑی اڑ کر بیٹھی ہے کہ مجھے لُخت (طلاق)

چاہیے۔ نہ تو ہمارے پینڈ میں کسی نے کبھی لُخت دی ہے اور نہ ہی ہمارے پنڈ کی کسی دھی (بیٹی) کو لُخت ہوئی ہے۔“

رحمت جوئیہ بولتا رہا اور مائی چیمبی سنتی رہی۔ پنچائیت بیٹھ چکی تھی۔ چانن پور گاؤں والوں کی نظریں مائی چیمبی پر لگی ہوئی تھیں۔

”لُخت لینے سے بہتر ہے... توئے کی کالک منہ پر مل لی جائے۔ اگر لُخت ہوئی تو اس علاقے میں ایسا

پہلی بار ہوگا اور اُس کی ساری ذمہ داری چانن پور والوں پر ہوگی۔“ رحمت جوئیہ نے آخری بات کی۔

”چوہدری رحمت! طلاق حلال ہے... حلال کام کرنے سے منہ کالا نہیں ہوتا اور جہاں تک توئے کی

کالک کی بات ہے اُسے پانی دھو دیتا ہے اور گناہوں کی کالک پانی سے صاف نہیں ہوتی... تم صرف گناہوں کی کالک کی فکر کرو... توئے کو ہم خود ہی مانج (صاف) لیں گے... کھانا کھا کر جانا فیصلہ کل ہوگا۔“ مائی چیمبی نے تخیل سے جواب دیا۔

اُسی دن رات عشاء کے بعد بشیر حسین کے گھر چانن پور گاؤں کے سارے سیانے اکٹھے ہوئے۔

شبانہ عرف شبو، شہباز جوئیہ کی بیوی تھی اور بشیر حسین کی بیٹی۔

جب شبو کا رشتہ بشیر نے قبول کیا تھا مائی چیمبی نے اُسی وقت ہی کہا تھا:

”پا بشیر! تم نے مشورہ کرنا بھی بہتر نہ سمجھا، شبو میری بھی دھی ہے، میں تمہیں اچھا مشورہ ہی دیتی۔“

”بس آپا وڈی (بڑی)! کیا بتاؤں انھوں نے مجھے اپنے ڈیرے پر بلایا، رشتے کی ہاں کروا کر ہی

اٹھنے دیا۔ اچھا بھلا اپنے ماسی کے پتر کی منگ تھی۔ اُس شودے نے انکار کر دیا۔“ بشیر حسین خود کو ملامت کر رہا تھا۔

بشیر حسین کی ایک بھگیا زمین جوئیہ خاندان کی زمین کے ساتھ تھی جہاں پر چانن پور کا رقبہ ختم ہوتا

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

وہاں سے دھڑی وال کا رقبہ شروع ہوتا۔

جونیہ خاندان دھڑی وال کے چوہدری تھے اور بشیر حسین اُن کا مزارع۔ ایک دن شہباز جونیہ کی نظر شبانہ عرف شبو پر پڑی تو اُس نے شبانہ کا راستہ روک لیا۔

”کیا تو بشیرے کی بیٹی ہے؟“

شہباز جونیہ اپنی نیلی اتھری گھوڑی پر بیٹھے بیٹھے ہی بولا۔ شبو نے شہباز کو دیکھے بغیر سر کو ہاں میں جمنش دی میچی ہوئی آنکھوں کے ساتھ۔ قرب و جوار میں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ شبو اپنے باپ کو کھانا دینے کھیتوں میں آئی تھی۔ اُس دن اس کی ماں کی طبیعت جو خراب تھی۔ شہباز جونیہ بھونڈے اور لُچر پن سے پھر بولا:

”تیرے حسن کی بڑی دھوم سنی تھی... سب سچ کہتے ہیں... جو سنا تھا اس سے بڑھ کر دیکھ لیا۔“

شہباز جونیہ نے گھوڑی سے چھلانگ لگائی اور شبو کی طرف بڑھا۔ شبو نے جلدی سے اپنے باپ کی دارانٹی اپنی چادر سے نکال کر شہباز جونیہ کی طرف تان دی۔ جب شبو نے شہباز کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا اُس نے اُسی لمحے دارانٹی اپنی حفاظت کے لیے اپنی چادر میں چھپالی تھی۔

”چوہدری! آگے نہ بڑھنا۔“ شبو نے اپنی بند آنکھیں کھولیں، آنکھوں میں انگارے بھرے ہوئے

تھے۔

”اُوئے ہوئے... آنکھوں میں بھاہ بھڑ (الاء) ہیں... اتھری گھوڑی اور اتھری کڑی دونوں ہی شہباز

جونیہ کی ضد ہیں۔“

”چوہدری! کسی کی امانت کو اپنی ضد مت بنا... گھوڑی ضد ہو سکتی ہے... گڑی نہیں...“ شبو نے اعتماد

سے جواب دیا سخت لہجے میں۔

”ایک ضد دوسری ضد پر بیٹھ تو سکتی ہے... آجا! رانی بنا دوں گا تجھے... جو آگ تو نے لگائی ہے... بس

اُسے بجھاتی جا...“ شہباز جونیہ نے اپنی مونچھوں کو تالاؤ دیتے ہوئے ہونٹوں کو دانتوں سے چباتے ہوئے کہا۔

”میں کسی اور کے دل کی رانی ہوں... چوہدری! ہٹ جا میرے راستے سے۔“ شبو نے دارانٹی کو

کس کر پکڑا اور غصے سے شہباز جونیہ کو لاکارا۔

”یا تو میں تجھے مار دوں گی... نہیں تو اپنی جان دے دوں گی... پر جو تو چاہتا ہے وہ کبھی نہیں ہو سکتا۔“

شبو نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
شہباز جوئیہ ایک بھیڑیے کی طرح شبو پر ٹوٹ پڑا اور اُسے اپنی تگڑی گرفت میں لے لیا، دارانتی
چھین کر اُسے دور پھینک دیا۔

”کنجرا!... دلتے... بے غیرت...!“ شبو نے شہباز کی گرفت سے خود کو چھڑاتے ہوئے کہا۔
بامستی چاول کی فصل اپنے جو بن پر تھی اور وہ جگہ دونوں دیہاتوں کے درمیان میں، دوپہر کا وقت
بھی شہباز جوئیہ کے حق میں تھا۔ شہباز اور شبو کی نوراکشتی جاری تھی، وہ گتھم گتھا تھے۔
”چھوڑ دے بے غیرت مجھے!“ شبو ایک زخمی شیرنی کی طرح غرائی۔

”تو ایک مرد کے شلنگے میں ہے۔“ شہباز جوئیہ چلایا۔ اچانک شبو کے ہاتھ وہ دارانتی لگ گئی۔ اس
نے پورے زور سے چلائی جو شہباز کے بائیں بازو پر جا کے لگی، گھاؤ گھرا تھا، شہباز جوئیہ زمین پر بیٹھ گیا دائیں
ہاتھ سے اپنے بائیں بازو کو پکڑے ہوئے۔
”اُخ تھو...“ شبو نے شہباز کی طرف تھوکا حقارت سے۔

”تو اپنے آپ کو مرد کہتا ہے... پہلے تو بھکاری بنا اور اپنی خواہش کی بھیک مانگی... پھر تو ڈاکو بن گیا...
مرد کدھر سے ہے تو؟ بھکاری مانگتا ہے... اور ڈاکو چھینتا ہے... صرف مرد حاصل کرتا ہے... لعنت تجھ جیسے مرد
پر...!“

شبو کے کپڑے کئی جگہ سے پھٹ گئے تھے، اُس کے جسم پر جگہ جگہ شہباز کی درندگی کے نشان تھے پر
اس کی عزت بچ گئی۔ شبو نہ روئی تھی اور نہ ہی اُس نے شہباز سے رحم کی اپیل کی تھی۔ وہ لڑی اپنی عزت کی
حفاظت کے لیے اور جیت گئی۔ گھر واپسی پر اُس نے کھال سے منہ دھویا، اپنے بال سمیٹے، اپنی چادر سے اپنا
چہرہ اور جسم ڈھانپا اور چپ چاپ گھر واپس آ گئی۔

اگلے دن ایک خبر آئی اُس کے ماسی کے بیٹے اور منگیتر نے منگنی توڑ دی۔ چوہدری شہباز نے شبو کے
منگیتر صابر کے کان بھرے اور ایک ہفتہ کے اندر اندر اُس کا نکاح اپنے گاؤں کی ایک لڑکی سے کروا دیا۔ اب
تک اندر کی بات شبو اور شہباز کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ چند دن بعد شبو کے باپ نے گھر آ کر فیصلہ سنایا:
”کل شبو کی جج (بارات) دبھڑی وال سے آرہی ہے۔“

شبو نے بہت شور شرابہ مچایا پر اس کا باپ زبان دے چکا تھا۔ شبو کا بھائی شاہد جو کہ اس وقت میٹرک
میں تھا وہ اپنی بہن کے بہت قریب تھا اس نے شبو کو قسم دے کر ساری بات پوچھ لی۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”شبو باجی! تم شادی کر لو... اللہ خیر کرے گا۔“ شاہد حسین نے اپنی بہن کو مشورہ دیا۔
سارے لوگ برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مائی چیمبی اندر شبو کے پاس چلی گئی۔ شبو گم سم بیٹھی تھی۔ شاہد اُس کے پاس تھا۔

”شبو بیٹی! مجھے لگتا ہے... کچھ گپت (راز) ہے جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو... دیکھو دھی رانی! مجھے سچ سچ بتاؤ اندر کی بات...“

شبو نے ساری بات مائی چیمبی کو بتائی۔ شاہد بھی وہیں موجود تھا۔ شبو نے اپنے آنسو صاف کیے۔

”شاہد تم باہر جاؤ!“ شبو نے شاہد سے کہا۔ شاہد باہر چلا گیا۔

”اب تم کیا چاہتی ہو؟“ مائی چیمبی نے پوچھا۔

”ابھی آپ نے ساری بات سنی کہاں ہے۔ شاہد کے سامنے بتا نہیں سکتی تھی۔“ شبو نے مائی چیمبی کو

جواب دیا۔

”انماں چیمبی! شادی کی پہلی رات ہی سے شہباز میرے جسم کو گدھ کی طرح نوچ رہا ہے۔ وہ روز رات کو شراب پی کر آ جاتا اور صبح تک میرے جسم کو نوچتا رہتا ہے۔ اماں چیمبی! وہ میرے جسم پر جلتی ہوئی سگریٹ بجھاتا ہے اور کہتا ہے:

تم میری ملکیت ہو جو چاہے تمہارے ساتھ کروں... مجھے کون روک سکتا ہے... یہ بھی کہتا ہے:

ابھی ضد پوری کی ہے... انتقام ابھی باقی ہے... شہباز کے ساتھ بیس دن میں نے انگاروں پر گزارے ہیں۔“ شبو نے اپنے خاموش آنسو صاف کیے جو چپ چاپ گرتے جا رہے تھے، مائی چیمبی اور شبو رات گئے تک باتیں کرتی رہیں۔

اگلے دن مائی چیمبی کے ڈیرے پر پنچائت لگ گئی۔ مائی چیمبی اپنے رنگے پلنگ پر گول تکیے کے ساتھ ٹیک لگائے پوری شان سے بیٹھی تھی۔ پچپن سال کی عمر میں بھی کسی جوان کو کلائی سے پکڑ لے تو وہ چھڑا نہ سکے... مائی چیمبی اونچے لمبے قد کاٹھ کی پُر وقار عورت تھی۔ چوہدری رحمت نے بولنا شروع کیا ہی تھا کہ شہباز بول پڑا۔ اُسے اپنے تایا کا مائی چیمبی کے سامنے عاجزانہ لب و لہجہ ناگوار گزرا تھا۔

”تایا! اتنے ترلے کیوں ڈال رہے ہو... مائی نے اگر فیصلہ ہمارے حق میں نہ دیا تو... میں شبو کو اٹھا

کر لے جاؤں گا۔“ شہباز جوئیہ نے اپنے تیور دکھائے۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
 ”چوہدری رحمت! پٹا ڈال اس منڈے کو...! نہیں تو.... مجھے ڈالنا آتا ہے۔“ مائی چیمپی نے تحمل سے
 کہا۔

”کا کا شہباز! شبو کو اٹھانے سے پہلے تو اٹھ جائے گا دنیا سے...“ مائی چیمپی کی آواز پر چانن پور کے
 لوگوں نے لبیک کہا۔

”چوہدری برکت! سمجھا اپنے بیٹے کو پنچائت میں بڑوں کی بات میں نہیں بولتے۔“ ماسٹر نذیر نے
 شہباز کے باپ کو یاد کرایا۔ پوری پنچائت میں شور مچ گیا۔ کوئی کہہ رہا تھا:
 ”ہم نے گڑی نہیں بھیجی، دبھڑی وال والے جو کر سکتے ہیں کر لیں۔“
 دوسری طرف سے آواز آئی:

”بڑا بے ہدایتا منڈا ہے... تائے نے بگاڑ دیا ہے۔“
 مائی چیمپی نے اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ پنچائت میں خاموشی چھا گئی۔
 ”چوہدری رحمت! تو بول کیا چاہتا ہے؟“ مائی چیمپی نے چوہدری رحمت کو مخاطب کیا۔
 ”بہن چیمپی! گڑی ٹور دے۔“ چوہدری رحمت نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

”چوہدری رحمت! ٹھیک ہے... پر میری کچھ شرطیں ہیں... شبو میرے گھر سے جائے گی میری بیٹی
 بن کر، حق مہر میں دس ایکڑ زمین شبو کے نام لکھ دو... چوہدری رحمت! بے شک طلاق حلال ہے پھر بھی کوئی
 ماں اپنی بیٹی کے لیے طلاق نہیں چاہتی... یہ فیصلہ میں نے ماں بن کر کیا ہے... منصف بن کر نہیں... تم دونوں
 بھائیوں کا رقبہ ملا کر بھی میرے رقبے کا آدھا بنتا ہے، تحصیل میں بھی میری زیادہ چلتی ہے، تیرا آدھا گاؤں
 تیرے ساتھ ہے اور میرا پورا گاؤں میرے ساتھ کھڑا ہے، تھانے دار میرے اشارے کا منتظر ہے... جو باتیں
 تیرے منڈے کے بارے میں مجھے پتہ ہیں کوئی نہیں جانتا... کا کا شہباز! کان کھول کر میری بات سن! اب شبو
 بشیر حسین کی بیٹی نہیں... چیمپی جی کی بیٹی ہے... یاد رکھنا! مائی چیمپی جی کی بیٹی! شکر کر میں نے تجھے جوانی مان لیا
 ہے۔ اگر شبو کو کنڈا چھا تو تجھے لوہے کا سووا چھو دوں گی۔ چوہدری رحمت تو اچھی طرح میری زبان کو جانتا
 ہے۔ کل شبو کو تحصیل لے جاؤ اور اُس کے نام دس ایکڑ لگا دو پھر میں شبو کو تمہارے ساتھ بھیج دوں گی۔“
 مائی چیمپی نے اپنا فیصلہ سنایا۔ رحمت جوئیہ اور برکت جوئیہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اس سے پہلے
 وہ مشورہ کرتے شہباز جوئیہ فٹک سے بول پڑا:

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”منظور ہے!“

پنچائیت ختم ہوگئی۔ سارے لوگ چلے گئے۔

”اماں چیمی! دس ایکڑ میں دس ہزار قبریں بن جاتی ہیں تم نے صرف میری قبر بنائی ہے۔“ شبو نے فیصلے کے بعد مائی چیمی سے کہا۔

”اگر تمھاری قبر بنی تو اس کے ساتھ شہباز جوئیہ کا مقبرہ ضرور بنے گا۔“ مائی چیمی نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔

”وہ جو کہتی ہے... وہ کر دیتی ہے... میرا مشورہ مانو لفظ دے دو میں اپنی رجو بیٹی کا ساکھ (رشتہ) دیتا ہوں۔“ رحمت جوئیہ کہہ رہا تھا برکت اور شہباز کو...

”برجھائی سمجھا اپنے لاڈلے کو... اوئے شہباز! تجھے پتر سے بڑھ کر چاہا ہے۔“ رحمت جوئیہ فکر مندی سے کہہ رہا تھا۔ وہ فکر کیوں نہ کرتا رحمت اور برکت کی سات بیٹیوں میں صرف ایک بیٹا شہباز ہی تھا۔

”میں نے بچپن سے تجھے جوانی مان لیا تھا... رجو تیرے نام کی انگوٹھی پہن کے بیٹھی رہی اور تو نے ایک کٹی کی دھی کو کڑے پہنا دیے۔“

”تایا! میں رجو سے نکاح کر لوں گا... بس آخری ضد پوری کر دے... میں نے شبو کو ایک بار لے کر آنا ہے... کسی بھی شرط پر... اُس کے بعد اسے...“

”اُسے کیا؟ ہمیں بھی تو بتا۔“ اس بار برکت جوئیہ بولا غصے سے۔

جوئیہ خاندان نے مائی چیمی کی شرط مان لی۔ شبو کی دوبارہ رخصتی ہوئی مائی چیمی کے گھر سے۔ شہباز جوئیہ نے بڑے اعزاز سے شبو کو اپنی نیلی گھوڑی پر بٹھایا اور اپنے گھر کی بجائے اپنے ڈیرے پر لے آیا جو گاؤں سے ہٹ کر تھا۔

”دلیسی دارو ہے... چکھ لے...! تھوڑی کڑوی ہے...! پہلے کون سا تو میٹھا بولتی ہے۔“ شہباز جوئیہ شراب کے نشے میں دھت گلاس شبو کی طرف بڑھا کر بولا۔

”دیکھ! میں نے ایک ضد کو دوسری ضد پر بٹھا ہی لیا۔ تجھے نیلی گھوڑی پر بٹھا کر لایا ہوں۔“

گدھ مردار کھاتے ہیں... وہ زندہ جسم کو نوچتا تھا۔ شہباز نام ہونے کے باوجود وہ ذات کا گدھ ہی تھا اُس نے شبو کے ننگے دھڑنگے جسم کو رات بھر نوچا... صبح سے پہلے اُس ننگے بدن کو کپڑے پہنانے کا حکم ملا...

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

شبو نے کپڑے پہن لیے۔ فجر کی اذان ہو چکی تھی۔ سخت سردی میں باہر گہرا جما ہوا تھا۔ شہاز نے کہا:
”چلو گاؤں چلتے ہیں۔“

شبو کو اُس نے پھر سے گھوڑی پر بٹھایا اور اپنے ڈیرے پر موجود کنویں کے پاس آکر رک گیا۔ شبو نے شہاز کی طرف دیکھا، شہاز کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ اُبھری۔

”دن نکلتا ہے پھر گاؤں چلتے ہیں، تم گھوڑی سے اتر آؤ سردی بھی بہت ہے۔“ شہاز نے ہاتھ بڑھایا شبو گھوڑی سے نیچے اتر آئی چپ چاپ۔ وہ مسلسل شہاز کے چہرے کو دیکھ رہی تھی شاید کچھ پڑھنا چاہ رہی تھی۔ شبو کے پچھلی طرف کنواں تھا اور سامنے دلدل یعنی شہاز جوئیہ۔

”مائی چیمی! یہاں اس وقت...“ شہاز اچانک بول پڑا۔ شبو نے پلٹ کر دیکھا۔ اسی لمحے شہاز نے شبو کو کنویں میں دھکیل دیا۔

تڑکے ہی چائن پور گاؤں میں شبو کے مرنے کی خبر پہنچی پر مختلف انداز میں...
”شبو نے شہاز کو زخمی کیا اور خود وہاں سے بھاگی... تاریکی ہونے کی وجہ سے کنویں میں گر گئی۔“
شبو کی موت کو تین دن گزر گئے۔ مائی چیمی ایک دم خاموش ہو گئی تھی۔ چوتھے دن پنچائت بیٹھ گئی۔
”جو کچھ شہاز جوئیہ نے اپنی صفائی میں کہا ہے میں اُسے سچ مانتی ہوں۔“ یہ کہہ کر مائی چیمی اپنے پلنگ سے اُٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔

”یہ کیسا فیصلہ ہے؟“

”جو سچ ہے!“

کسی اور سے فیصلے کروالیا کرو چائن پور والو!“

”تو کیا شہاز جوئیہ کو سولی پر لٹکا دیتی؟“

”مائی چیمی بوڑھی ہو گئی ہے۔“

”میں نے پہلے ہی کہا تھا شبو کو موت بھیجوا!“

”ہم اٹھارہ سال سے مائی چیمی کا ہر فیصلہ مانتے آئے ہیں، یہ بھی مانتے ہیں۔“ برکت جوئیہ نے آخری بات کہی تھی، رحمت جوئیہ فکر مند تھا۔

”تایا تو کیوں فکر کرتا ہے؟“ شہاز جوئیہ نے رحمت جوئیہ سے کہا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”تو ابے کو نکاح کی تاریخ دے... فکر نہ کر... تایا!“

”ابھی قبر کی مٹی گیلی ہے اور زخم ہرے ہیں... ابھی نہیں شہباز پُتر! تو شہر چلا جا چند دنوں کے لیے۔“
رحمت جوئیہ رندھی آواز کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

”چھوڑ تایا! شہر چلا جا...“ شہباز نے اپنی چادر کو جھاڑا گرجتے ہوئے۔

چند دن گزر گئے خاموشی سے کئی فیصلے آئے مائی چیمبی کے پاس مگر مائی چیمبی جی نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ ایک دن خبر آئی شہباز جوئیہ بھی اُسی کنویں میں گر کر مر گیا ہے۔ سارے علاقے میں مشہور ہو گیا کہ وہ ڈیرہ منخوس ہے اور وہاں جنوں اور ڈانٹوں کا قبضہ ہے۔

اس کہانی کا پورا سچ صرف چار لوگ جانتے تھے۔ شہباز جوئیہ، شبانہ عرف شبو، مائی چیمبی جی اور میں... جی ہاں میں! تین لوگ اب اس دنیا میں نہیں ہیں صرف میں زندہ ہوں۔ جس دن شہباز کنویں میں گرا تھا اُسی رات مائی چیمبی نے مجھے اپنے گھر بلایا تھا اور اس کہانی کا سارا سچ بھی بتایا، بہت ساری نصیحتیں کیں اُس رات کے بعد مائی چیمبی جی نے کبھی صبح کا اُجالا نہیں دیکھا۔ اُسے اپنے غلط فیصلے پر بہت پچھتاوا تھا۔ نرم بستر سے قبر کی سخت زمین پر لیٹنے سے پہلے اُس نے مجھے شہباز کی جاسوسی کے لیے کہا تھا۔ میں کئی دن شہباز کی جاسوسی کرتا رہا ایک دن شہباز جوئیہ ایک ویشیا کو لے کر آیا شہر سے... اپنے سارے دوستوں کو اس نے بھیج دیا تھا۔ آدھی رات تک ویشیا اور شہباز شراب پیتے رہے۔ اُس کے بعد اُن دونوں نے منہ کالا کیا۔ رات کے پچھلے پہر شہباز پیشاب کی غرض سے کمرے سے باہر نکلا۔ میں نے کمرے کی باہر سے کنڈی لگا دی۔ وہ لڑکی نشے میں دھت سوئی ہوئی تھی۔ مائی چیمبی نے شہباز کو اکیلے ہی دبوچ لیا۔ میں نے مدد کرنی چاہی تو مائی چیمبی بولی:

”بیٹا! تیرا کام صرف مخبری کرنا تھا۔“

شہباز جوئیہ کو کنویں میں جنوں نے نہیں گرایا تھا۔ اُسے مائی چیمبی نے یوں مارا جیسے پاگل کتے کو مارا جاتا ہے۔ اتنا مارا کہ وہ خود موت کی بھیک مانگنے لگا پھر اُس سے پوچھا کہ تم نے شبو کو کیسے مارا؟ اُس نے بتایا کہ وہ پوری رات نشہ کر کے اُس کے جسم کو نوچتا رہا پھر صبح نیلی گھوڑی پر بٹھا کر کنویں تک لایا اور دھوکے سے اُسے دھکا دے دیا۔

مجھے آج بھی یاد ہے اچھی طرح سے مائی چیمبی کے الفاظ:

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
”کا کا شہباز! تو بچ سکتا ہے... اگر تو مجھے کنویں میں گرا دے پھر نہ کہنا مائی چیمی نے انصاف نہیں
کیا۔“

شہباز جوئیہ نے کوشش بہت کی اپنی جان بچانے کی مگر ناکام رہا۔ میں نے ہمیشہ مائی چیمی کی بلبل کی
مانند میٹھی آواز سنی تھی۔ اُس دن مائی چیمی کی آواز میں کٹھور پن اور بیت تھی، اُس نے شہباز کی کسی التجا پر کان
نہیں دھرے۔ مائی چیمی نے شہباز کو گریبان سے پکڑا اور اُسے کنوئیں میں پھینک دیا، میں پاس کھڑا تھا۔
مائی چیمی کو اس فیصلے پر شبو کے والدین اور بھائی نے مجبور کیا تھا۔ مجھے پچاس سال پہلے کہے ہوئے
شبو کی ماں کے الفاظ اچھی طرح سے یاد ہیں:

”آپا وڈی! فیصلہ منصف بن کر نہیں... ایک ماں بن کر کرنا... شبو کی ماں بن کر... میں نہیں چاہتی کہ
شبو لٹ لے۔“

مائی چیمی نے شبو کے گھر والوں کی خواہش پر وہ فیصلہ کیا تھا جو اس کا آخری فیصلہ ثابت ہوا۔ مجھے
مائی چیمی نے ایک نصیحت یہ بھی کی تھی:
”منصف فیصلوں کی جگہ رشتوں کو ترجیح دے تو فیصلے غلط ہوتے ہیں اور ایک غلط فیصلہ کئی زندگیاں
بر باد کر دیتا ہے۔“

میں نے مائی چیمی کی باتوں کو ہمیشہ یاد رکھا اپنے فیصلوں کے دوران اور آج میں سرخرو ہوں۔
آج پچاس سال بعد بھی مائی چیمی کو نہیں بھولا صرف اس کے فیصلوں کی وجہ سے۔ آج میری آنکھوں میں آنسو
ہیں اپنی دلیر بہن کو یاد کر کے۔ مجھے فخر ہے کہ میں مائی چیمی جی کا شاگرد اور شبو کا بھائی ہوں!

ریٹائرڈ جسٹس شاہد حسین

☆.....☆.....☆

دل کے قصے میں

”دل کے قصے میں ہماری پھر سے ہار ہوئی
ایسا کئی بار ہوا ہمیشہ ہر بار ہوئی
کیسا لگا میرا شعر؟“ سید کاشف امین نے پوچھا اپنے سامنے بیٹھے ہوئے روحان حیدر کیانی سے۔
روحان نے مسکراتے ہوئے اپنے ابرو کو جنبش دی اور کہا:
”تمہارے جیسا ہی ہے۔“

”کیانی صاحب میں تم سے ملنے آیا ہوں وہ بھی اتنی سردی میں اور تم ہو کہ اس پینٹنگ میں بڑی ہو۔
ویسے ایک خبر ہے تمہارے لیے، مجھے پھر محبت ہو گئی ہے۔“
روحان نے کاشف کی بات سن کر ہنسنا شروع کر دیا، روحان جیسا بندہ جو کہ ہنسنے کے معاملے میں
انتہائی کنجوس تھا وہ اُس دن زور زور سے ہنس رہا تھا۔
”پچھلے دس سال میں غالباً چھ سات دفعہ تم یہ اعزاز حاصل کر چکے ہو۔“ روحان نے ہنستے ہوئے
کاشف کا ٹریک ریکارڈ اُسے بتایا۔

”اس بار سچی محبت ہے۔“ کاشف نے اپنی نیت بتائی۔
”کیا محبت بھی جھوٹی ہوتی ہے؟ سید کاشف مجھے یاد ہے تمہیں چودہ سال کی عمر میں پہلی محبت ہوئی
تھی اور آج دس سال بعد چھٹی یا ساتویں بار یہ گولڈ میڈل تم نے پھر حاصل کیا ہے۔“

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”یہ فائل ہے... ہفتہ پہلے فلائٹ میں اُس سے ملاقات ہوئی، مجھے ارفع اچھی لگی تھی، تیسری ملاقات میں اُسے دل کی بات کہہ دی۔ کل ممی پاپا کو اُن کی طرف بھیج دیا وہ بھی ایکسپوٹر ہی کی بیٹی ہے۔ آسٹریلیا میں پڑھتی تھی اپنی اسٹڈی مکمل کر کے لوٹی ہے۔ ارفع کے ڈیڈی پہلے سے پاپا کو جانتے ہیں۔ انھوں نے فوراً ہاں کر دی۔“ کاشف نے اچھے ٹی وی رپورٹر کی طرح ساری رپورٹ دی۔

”کاشف تم نے ہمیشہ دماغ سے محبت کی ہے، تم محبت نہیں معیار دیکھتے ہو۔ خوب صورتی کا معیار پھر خاندانی رتبہ، مقام اگر وہ لڑکی تمہارے معیار پر پوری اُتر جائے پھر تمہاری شرطیں شروع ہو جاتی ہیں۔ محبت عقل سے عقل والوں کے ساتھ نہیں کی جاتی بلکہ محبت دل سے دل رکھنے والوں کے ساتھ ہو جاتی ہے۔“ روحان نے سنجیدگی سے کہا۔

”بھائی صاحب! آپ والی محبت صرف کتابوں میں ملے گی۔ حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ چھ بار کا تجربہ ہے۔ تین لڑکیوں نے مجھے صرف اس لیے چھوڑ دیا کہ انھیں مجھ سے امیر اور اچھے لڑکے مل گئے تھے۔“ کاشف نے افسردگی سے جواب دیا۔ روحان مسکرایا اور بولا:

”دو دفعہ تو تم نے بھی گھر والوں کو خودکشی کی دھمکی دی تھی، ایک دفعہ نیند کی گولیاں بھی کھالیں تھیں، وہ کیا تھا؟“

”چھوڑو... دفعہ کرو پرانی باتیں... تم چائے کا بولو ساتھ کچھ کھانے کو بھی ہو۔“

کاشف نے مزید شرمندگی سے بچنے کے لیے جلدی سے بات بدل دی۔

روحان اور کاشف بچپن کے دوست تھے۔ روحان کے ابا کارگل کی جنگ میں شہید ہو گئے تھے۔ اس کی ماں مرے کالج سیالکوٹ میں اردو کی پروفیسر تھیں، روحان کی ماں نے دوبارہ سہاگن بننے کے بجائے شہید کی بیوہ رہنے کو ترجیح دی، روحان بڑا تھا اُس سے چھوٹی ایک بہن تھی۔

کاشف کا تعلق ایک بڑے خاندان سے تھا۔ وہ مالی اور افرادی قوت سے مالا مال تھا۔ کاشف کے خاندان میں رشتہ داری اور تعلق داری، مالی نفع نقصان دیکھ کر کی جاتی تھی۔

کاشف کے باپ نے یہ رشتہ بھی بزنس ڈیل کی طرح ہی کیا تھا۔ کاشف اپنے باپ کی تین فیکٹریوں میں سے ایک دیکھتا تھا۔ اس کے برعکس روحان ایک مشہور پیٹرن بننا چاہتا تھا، وہ NCA سے حال ہی میں پاس آؤٹ ہوا تھا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
روحان نے برش اور پینٹ پلیٹ رکھی اور کمرے سے چلا گیا، کاشف اس پینٹنگ کے پاس آ کر کھڑا
ہو گیا جو کہ روحان بنا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد روحان ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔
”ماں جان نے پہلے ہی چائے بنا دی تھی۔“ روحان نے ٹرے رکھتے ہوئے کاشف کی طرف دیکھتے
ہوئے بتایا۔

”یہ تصویر تو کسی لڑکی کی ہے!“ کاشف نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔
”ہاں!“ روحان نے پرچ کپ کاشف کو تھماتے ہوئے مختصر سا جواب دیا اور اپنی چائے پینے میں
مصروف ہو گیا۔ اس کی نظریں پینٹنگ پر ٹکی ہوئی تھیں اور کاشف کی اُس کے رخسار پر۔
”سیدھی طرح کہو بھابھی کی تصویر بنا رہے ہو۔“ کاشف جا بختی نگاہوں سے روحان کی طرف
دیکھتے ہوئے بولا۔

”روجی چوہدری بھی تو لڑکی ہی ہے۔“ روحان نے سنجیدگی سے کاشف کو بتایا۔
”اور وہ لڑکی تمھاری مگنیتر بھی تو ہے۔“
”تو؟“

”ہماری فیکٹری والی مسجد کے مولوی صاحب بتا رہے تھے، تصویریں بنانے والے جہنم میں جائیں
گے۔“ کاشف نے مولوی صاحب کی جمعہ کی تقریر سے اقتباس سنایا۔
”اس جمعہ مولوی صاحب سے پوچھنا ”سلفی“ بنانے والے بھی اُس میں شامل ہیں یا پھر صرف
پینٹرز ہی کو دوزخ میں جانا ہے؟“ روحان چائے ختم کر کے اپنا برش پکڑتے ہوئے کہا۔
”سنس آف ہیومر تو تمھارا بچپن ہی سے بہت اچھا ہے۔“ کاشف بھی چائے ختم کر کے روحان کے
پاس کھڑا ہو گیا۔

”تم نے رنگوں کی مدد سے اپنی محبت کو اس پینٹنگ میں قید کر لیا ہے۔“ کاشف کی بات میں تعریف
کم اور شرارت زیادہ تھی۔
”سید کاشف! محبت رنگوں کی قید سے آزاد ہے۔“ روحان نے پینٹنگ پر اسٹروک لگاتے ہوئے
جواب دیا۔

”کچھ بھی کر لو یہ لڑکیاں کسی قید کو نہیں مانتیں۔ یہ سیدھی نہیں ہو سکتیں، یہ ٹیڑھی ہی رہیں گی۔“ سید

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

کاشف نے اپنا دکھڑا رویا۔

”کیوں کرنا چاہتے ہو لڑکیوں کو قید؟“ روحان نے بغیر دیکھے پوچھا۔

”چلو سیدھی ہی ہو جائیں۔“ کاشف نے دوسری خواہش بتادی۔

”سیدھا کرنا چاہو گے تو وہ ٹوٹ جائیں گی مگر سیدھی نہیں ہوں گی۔ اللہ رب العزت نے عورت کو

پہلی سے پیدا کیا ہے۔ پہلی ٹیڑھی تھوڑی ہے۔ وہ تو کمان ہے۔ عورت بھی کمان ہی کی طرح ہے۔ زندگی کی

جنگ میں بچاتی بھی ہے اور مرواتی بھی ہے، اگر یہ کمان حیا کی رسی سے بندھی رہے تو سید کاشف! اسے سیدھا

کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

روحان نے برش رکھا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر اپنے دونوں ہاتھوں کو بگلوں میں دبا کر کھڑا ہو گیا اور

اپنی تخلیق کو دیکھنے لگا۔

بھنویں ایسی جیسی کمان ہوں... نظریں تیر جیسی... گال ایسے جیسے دھکتے انگارے... گھٹا گھنگور جیسے

گیسو... شرتی نین... موتیوں کی طرح چمکتے دانت... یہ سانولی سالونی اور نمکین لڑکی روجی چوہدری کی تصویر تھی۔

روجی چوہدری دہنگ لڑکی تھی۔ اُس نے خود روحان سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ یہ اُن دنوں کی بات

ہے جب روحان NCA میں پڑھتا تھا اور روجی چوہدری پنجاب یونیورسٹی کے اولڈ کیمپس میں پڑھتی تھی۔

روجی چوہدری اور روحان حیدر کیانی آپس میں خالہ زاد تھے۔ روجی روحان کی سب سے بڑی خالہ کی سب

سے چھوٹی بیٹی تھی۔ روحان ہاسٹل میں رہتا تھا اور کبھی کبھار اپنی خالہ کی طرف سمن آباد چلا جاتا، روحان کے دل

میں کبھی بھی روجی کے لیے کوئی ایسا جذبہ نہیں تھا۔ اس کی وجہ شاید روجی کی بے باک، بے مہار اور بے ہنگم قسم کی

شخصیت تھی۔

ایک دن روحان کی خالہ نے سمن آباد اُسے اپنی طرف بلایا۔ سردی کی آمد آتی تھی رات کا کھانا کھانے

کے بعد روحان چھت پر کبوتروں کے ڈربے کے پاس سگریٹ سلگائے کھڑا تھا۔ وہ خالہ اور خالو کے احترام کی

وجہ سے چھت پر سگریٹ پینے چلا آیا، روحان اپنی سوچوں میں کھویا ہوا تھا۔ تب روجی چھت پر چلی آئی۔

”پینٹر بابو! کن سوچوں میں گم ہو؟“ روجی دو فٹ پیچھے کھڑی ہو کر بولی۔ روحان واپس مڑا تو چائے

کے مگ گرتے گرتے بچے تھے جو کہ روجی کے ہاتھوں میں تھے۔

”ماما نے کہا چائے اوپر ہی لے جاؤ۔“ روجی نے چائے پکڑاتے ہوئے کہا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

دونوں چپ چاپ چائے پیتے رہے۔ چائے ختم کرنے کے بعد روحان بولا:

”میں چلتا ہوں۔“ روحان نے نیچے جاتی سیڑھیوں کی طرف قدم اٹھائے ہی تھے، روجی کے تین لفظوں نے اُس کے قدم روک دیے۔

”آئی لو یو۔“

روحان نے پلٹ کر روجی کی طرف دیکھا۔

”بچپن سے محبت کرتی ہوں تمہیں۔“ روجی بے باکی سے بول رہی تھی۔ روحان کے چہرے پر

حیرت تھی۔

”ایسی ہی ہوں میں۔ تم تو کبھی نہ کہتے یہ سب... اس لیے میں نے ہی کہہ دیا ہے۔“ روجی نے محبت کا اظہار ایسے کیا جیسے حکم سنایا ہو۔ روحان تھوڑی دیر تک اُس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ اس کے بعد پلٹا جانے کے لیے۔ روجی نے بڑھ کر روحان کی کلائی پکڑ لی۔

”میسجر کے بیٹے ہو کر بھی... تم تو بہت ہی ڈرپوک ہو۔“

”میسجر کا بیٹا بزدل ہو تو کوئی بات نہیں مگر اُسے بے حیا نہیں ہونا چاہیے۔“ روحان نے کلائی چھڑاتے

ہوئے جواب دیا۔

”محبت کا اظہار ہے، بے حیائی تھوڑی ہے!“ روجی نے روحان سے آنکھیں ملاتے ہوئے اپنی

صفائی دی۔

”حیا کو بے باکی دھکا مار دے تو... وہ بے حیائی بن جاتی ہے۔“

”اس بے باکی پر اپنی محبت کی چادر ڈال دو۔“ روجی چوہدری دیدہ دلیری سے بولی۔

”میری چادر میں گزرے دنوں کی چند یادیں لپٹی ہیں۔“ روحان نے کھوئی کھوئی آواز کے ساتھ

جواب دیا۔

”اُن یادوں کی رہائی کا وقت آ گیا ہے۔“ روجی نے روحان کا ہاتھ تھامتے ہوئے محبت سے کہا۔

”روجی!“ روحان نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور اپنی جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکالی اور سگریٹ جلایا اور لمبا

کش لگا کر بولا:

”سارا گیلانی میری کلاس فیلو تھی۔ NCA جوائن کرنے کے تیسرے دن سے لے کر تین سال تک

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
 ہم اکٹھے رہے۔ وہ اکثر مجھے کہتی تھی: روحان اگر تم مجھے نہیں ملے تو میری روح نکل جائے گی۔ سارا کی روح تو
 نہیں نکلی... وہ ضرور اپنے ہسپینڈ کے ساتھ لندن کو نکل گئی۔ اُس نے شادی کرنے کی وجہ بتائی نہیں اور میں نے
 پوچھی نہیں۔ آپ تو خود ہی روح... ہی... ہیں۔“

روحان نے پرانی یادوں کا دریچہ بند کیا سگریٹ کو دیوار کے ساتھ ملیا میٹ کیا اور وہاں سے چلا گیا۔
 چند دنوں کے بعد روحان کی ماں نے اُس سے رائے طلب کی کہ اگر اُس کا رشتہ روجی سے کر دیا جائے تو اُسے
 کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟

”روحان بیٹا! آپا، روجی کے رشتے کو لے کر بہت پریشان ہیں، انھوں نے خود مجھ سے اس سلسلے
 میں بات کی تھی۔ روجی کو تو تم بہت پسند ہو۔“ روحان نے حیرانی سے اپنی ماں کو دیکھا اور کہا:
 ”ماں جان آپ! کیا آپ اُس لڑکی کے ساتھ رہ سکتی ہیں؟“ روحان کی ماں نے کچھ دیر سوچا پھر بولیں:
 ”تھوڑی بد لحاظ ہے... اور...“

”اور یہ کہ آپ اپنی بہن کی محبت میں یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ روجی کو اپنی بہو بنا لیا جائے۔ ماں
 جان! آپ روجی کے ساتھ نہیں چل سکتیں۔“

”روحان! آپا نے مجھ سے بات کی تھی، میں نے انھیں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں روحان کی
 مرضی پوچھے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اب تم بتاؤ تمھاری کیا رائے ہے؟“

”پہلے آپ بتائیں آپ کے دماغ میں کیا چل رہا ہے؟“ روحان نے سوال پر سوال کر دیا تھا۔

”دیکھو روحان! اب ایسی بُری بھی نہیں ہے روجی...“

”مطلب آپ فیصلہ کر چکی ہیں؟“ روحان نے آگے بڑھ کر اپنی ماں کو گلے لگایا تھا۔

”جیسے آپ کی خوشی... ماں جان!“

روحان حیدر کیانی اب بھی اپنی تخلیق میں کھویا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر تک سید کاشف اُسے دیکھتا رہا۔ پھر
 واش روم چلا گیا۔ جب وہ واش روم سے لوٹا تو روحان اُسی پوز میں کھڑا تھا۔

”جناب اس پینٹنگ سے باہر نکل آئیں۔“

روحان کی نظریں تو پینٹنگ پر تھیں مگر اس کے ذہن میں یادوں کا میموری کارڈ ON تھا۔

”لگتا ہے بھابھی سے بہت محبت کرتے ہو۔“ سید کاشف نے روحان کو چھیڑا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
”آج ایک سچ بولوں؟“ روحان نے ایسے کہا تھا جیسے وہ سید کاشف سے سچ بولنے کی اجازت مانگ
رہا ہو۔

”مجھے روجی سے کبھی بھی محبت نہیں رہی، میری محبت تو سارا تھی۔“

”سارا؟ کون سارا؟“ سید کاشف حیرت سے بولا۔

”پتہ نہیں... نام تو اس کا سارا گیلانی تھا پر میں یہ نہیں جان سکا کہ وہ کیا تھی... اور کون تھی۔ میں تو
روحی کو بھی نہیں جانتا... یہ کون ہے؟“ روحان کھویا کھویا بول رہا تھا۔

”میری بات پھر ٹھیک ہوئی نا! کہ لڑکیاں ٹیڑھی ہوتی ہیں۔“ سید کاشف غلت میں بولا۔

”نہیں! لڑکیاں تو پہیلیاں ہیں... پاتال سے گہری... سیپ کے اندر موتی جیسی... کبھی نمکین اور کبھی
میٹھی... جسے تم ٹیڑھا پن کہتے ہو وہ تو اُن کی اصل ہے۔ اصل کی نقل تو ہو سکتی ہے اصل کی ساخت نہیں بدلی جا
سکتی وہی ٹیڑھا پن، نزاکت اور ادائیں لڑکیوں کی خوب صورتی ہے۔“

”سات دفعہ محبت میں نے کی اور تجربہ تمہارے پاس ہے۔“

”محبت کے کھیل میں کوئی تجربہ کار نہیں ہوتا... سب کے سب اناڑی ہی رہتے ہیں۔“

روحان اٹھا اور اپنا روم اندر سے بند کیا، ایک دراز کو چابی لگا کر کھولا اُس میں سے سگریٹ کی ڈبیا،
لیٹر اور الیش ٹرے نکال کر سامنے ٹیبل پر رکھا۔ ایک سگریٹ لگا کر سید کاشف کو دیا اور دوسرا اپنے لبوں سے
لگایا۔ پھر کمرے میں دھوئیں کے غبارے اُڑنے لگے۔

”میں تو ممی پاپا کے سامنے بھی سگریٹ پی لیتا ہوں۔“ کاشف نے اپنی عادت بتائی۔

”کچھ عجیب سا لگتا ہے اس طرح سگریٹ پینا... اس سے زیادہ عجیب بات تو یہ ہے کہ ایک شہید
آرمی میجر کا بیٹا پیئٹر ہو... پتا سب کو ہے کہ میں سگریٹ پیتا ہوں مگر کسی کے سامنے کبھی نہیں، میں اپنی خامیاں
اور ناکامیاں چھپانا چاہتا ہوں۔“

”دوستوں سے بھی؟“ کاشف نے پوچھا۔

”ہاں! دوستوں سے بھی... سارا گیلانی نے مجھے چھوڑ دیا، یہ بات روجی کے بعد تمہیں بتائی ہے۔“

روحان نے صوفے کے اوپر خود کو دراز کیا۔ گردن کی ٹیک لگائی اپنے غم کو دھوئیں کے ذریعے اندر

سے نکالا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
 ”سید کاشف! میرے لیے بڑی تکلیف کی بات ہے کہ کوئی مجھے چھوڑ دے اور وجہ بھی نہ بتائے...
 محبت میں ہم دونوں کی مرضی شامل تھی تو جدائی کا فیصلہ وہ اکیلے کیسے کر سکتی ہے؟“
 ”شادی تم روجی سے کر رہے ہو اور تمہارے دل میں سارا گیلانی ہے۔“ سید کاشف کو تشویش لاحق ہوئی۔
 ”نہیں! روجی مجھ سے شادی کر رہی ہے۔“ روحان اوپر کی طرف بند CEILING FAN کو دیکھ
 کر بولا۔

”سید کاشف! اُس FAN کو دیکھو، تین پر ہیں۔ سارے ایک ہی مدار کے ساتھ جڑے ہوئے
 ہیں۔ یہ محبت کا مدار ہے اور ہم تینوں تین پر ہیں، ہم جتنا مرضی تیز گھوم لیں ایک دوسرے کے پیچھے ایک
 دوسرے کو چھو بھی نہیں سکتے، یہی حقیقت ہے۔“
 ”تمہارا پوائنٹ آف ویو میری سمجھ سے باہر ہے، محبت کرنے والے تو محبوبہ کی تصویر بناتے ہیں اور تم
 نے ہونے والی بیوی کی بنائی ہے۔“
 ”میری محبوبہ اب کسی کی بیوی ہے! میرے دل نے کہا محبوبہ نے تو وفا نہیں کی، شاید ہونے والی
 بیوی کرے اس لیے روجی کی تصویر بنائی ہے۔“
 ”اُف یو ڈونٹ مائنڈ، ایک بات بولو؟“ سید کاشف نے اجازت مانگی۔ روحان نے گردن موڑ
 کر پلکوں کو بند کر کے کھولا۔
 ”اگر روجی چوہدری بھی سارا گیلانی کی طرح نکلی تو؟“ روحان کے چہرے پر دھیمی دھیمی مسکراہٹ
 اُبھری۔ اُس نے کہا:

”وہ کیا بے وزن شعر تم نے سنایا تھا؟“
 ”دل کے قصے میں ہماری پھر سے ہار ہوئی
 ایسا کئی بار ہوا ہمیشہ ہر بار ہوئی“
 سید کاشف نے جلدی سے اپنا شعر سنایا۔
 ”سید کاشف اس بار ہماری نہیں صرف تمہاری ہار ہوگی کیوں کہ تمہاری شادی مجھے ایک بزنس ڈیل
 لگ رہی ہے جو زیادہ دن نہیں چل سکتی۔“
 سید کاشف نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا:

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”روحان حیدر کیانی! تمہارے بقول ہم لوگ سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں سوائے برنس میں نقصان کے۔ اگر ایسی بات ہوئی تو عمر بیت جائے گی نقصان نہیں اٹھائیں گے ہم لوگ... تم اپنی بات کرو اس دفعہ دل کے قصے میں اگر تمہاری ہار ہوگئی تو؟“

”اگر اس بار دل کے قصے میں ہار ہوئی تو میں زندگی ہار جاؤں گا۔“ روحان نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اُسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی روحان نے جلدی سے ایش ٹرے، سگریٹ اور لیٹر سب کچھ اٹھایا، روم اسپرے کیا اور سید کاشف کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا اور خود واش روم سے موٹھ واش کی کلی کر کے واپس آیا۔ روحان کی ماں جان اور اس کی چھوٹی بہن رات کا کھانا لے کر آئی تھیں۔

”آئی! آپ ایک میڈ کیوں نہیں رکھ لیتیں؟“ سید کاشف نے جلدی سے مشورہ دیا اس سے پہلے کہ روحان کی ماں کچھ پوچھتیں۔

”کاشف بیٹا! ہم تین افراد ہیں اور ہم تینوں خود اپنا اپنا کام کرنے کے عادی ہیں۔ تم کھانا کھاؤ۔“ روحان کی ماں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے بعد روم سے چلی گئیں۔

روحان اور کاشف کھانے میں مشغول ہو گئے۔ اس دوران روحان کے سیل فون پر گھنٹی بجی جو کہ دوسرے صوفے پر پڑا ہوا تھا۔ کاشف نے اُسے بتایا:

”روحان! تمہارا فون بج رہا ہے۔“

”کھانے کے دوران میں کسی کا بھی فون اٹینڈ نہیں کرتا۔“

روحان نے بے پرواہی سے کہا۔ اس اثناء میں تین CALLS آئیں۔ اُس کے تھوڑی دیر بعد ایک MESSAGE بھی آیا، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سید کاشف چلا گیا تھا۔ روحان برتن کچن میں چھوڑ کر لوٹا اُس نے اپنا سیل فون پکڑا، روجی نے تین کالز کی تھیں۔ روحان نے کال بیک کی تو روجی کا نمبر بند ملا۔ اُس نے دوبارہ نمبر ملایا، فون بند تھا۔ اُس نے میسج چیک کیا وہ بھی روجی ہی کا تھا۔ روحان نے میسج منہ میں پڑھنا شروع کیا۔

”ڈیر فیانسی! تھینکس تم میرے بہت کام آئے... تمہیں یاد ہوگی پچھلے نومبر کی وہ رات جب تمہیں کھانے پر ماما نے بلایا تھا، دراصل وہ میرے کہنے پر ہوا تھا۔ ماما اور پاپا میری جلد سے جلد شادی کرنا چاہتے تھے۔ اُنہیں میرے اور شاہ ویز کے ریلیشن شپ کی خبر ہو چکی تھی۔ شاہ ویز ہماری گلی کے آخری مکان میں رہتا

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

تھا، اُس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی، میری وجہ سے یا پھر ایسے کہہ لو میرے کہنے پر... اُن دنوں شاہ ویز پاکستان میں تھا۔ شاہ ویز کینیڈا میں سیٹل تھا، میں نے اُس سے کورٹ میرج کر لی تھی۔ تمہیں ڈنر پر انوائٹ کرنے سے تین دن پہلے میرے گھر والے اس بات سے بے خبر تھے۔ مجھے ٹائم چاہیے تھا اس لیے تمہارا انتخاب کیا! میں نے ہی ماما سے کہا تھا تم سے انکچنٹ کرنے کے لیے۔ اس دوران میرے سارے ڈاکومنٹس کمپیٹ ہو گئے۔

بڑی ڈرامیٹک اسٹوری لگتی ہے نا؟ بٹ دس ازٹرو میں نے اپنے گولڈ سمتھ کے پاس جانے کے لیے بلیک سمتھ کو استعمال کیا۔

EVERY THING IS FAIR LOVE AND WAR

میں تمہاری سارا گیلانی جیسی تھوڑی ہوں، میں نے جس سے محبت کی اُسی سے شادی بھی کی۔ مجھے تمہیں جسٹی فیکشن دینے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ بس یہ پروف کرنا چاہتی ہوں میں سارا گیلانی سے بہتر ہوں۔ اُس نے تم سے محبت کر کے دھوکہ دیا اور میں نے اپنی محبت کو پانے کے لیے تمہارا استعمال کیا۔ سارا بغیر بتائے چلی گئی تمہاری زندگی سے اور میں بتا کر جا رہی ہوں اس وقت میں فلائٹ میں بیٹھی ہوں اپنے ہسپینڈ کے کندھے پر سر رکھ کر تمہیں تین کالز کیس تم نے رسپانس نہیں دیا اس لیے میسج چھوڑ رہی ہوں۔ ہمارا جہاز اُڑنے کے لیے ریڈی ہے۔ شاہ ویز کے آنے کی کسی کو خبر نہیں ہے اور میری اُس کے ساتھ جانے کی بھی کسی کو خبر نہ ہو۔ پلیز... پلیز... پلیز...

روحان نے روجی کا میج ڈلیٹ کیا اور موبائل کو اتنی زور سے دیوار پر مارا کہ وہ کرچی کرچی ہو گیا۔ روحان سیدھا اپنے بیڈ پر لیٹ گیا اُس نے شدید سردی میں CEILING FAN ON کر دیا اور اُسے دیکھنے لگا۔

صبح جب اُس کی ماں جان روحان کے کمرے میں آئی تو روحان لحاف کے بغیر کھلی آنکھوں سے FAN کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کی ماں نے پنکھا بند کیا۔

روحان تھا تو اپنے بستر پر... مگر اپنی روح کے بغیر۔ روجی کیا... روحان کو چھوڑ کر گئی، روحان کی روح نے بھی اُسے چھوڑ دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اکلوتا

اکلوتا بولنا شروع ہوا اور بولتا ہی گیا۔ اُس کے دل میں تیس سال سے بھرا ہوا لاوا آج اُبل پڑا تھا۔ بولنے والی زبان پر یہ الفاظ آج پہلی بار آئے تھے۔ یہ اُس کا غصہ تھا یا درد اندازہ لگانا مشکل تھا۔ سننے والا ان جملوں اور لفظوں سے اچھی طرح واقف تھا، ان کڑوے لفظوں سے اس کی زبان کی پرانی شناسائی تھی، اس کی زبان پر ان لفظوں کا ہی ذائقہ تھا، مگر اس کے کانوں نے آج پہلی بار ایسے لفظوں کی تپش محسوس کی تھی جس کی وجہ سے اس کے کان جوار بھاٹا بنے ہوئے تھے۔ اگر کوئی اور ہوتا تو وہ اس کی زبان حلق سے نکال لیتا۔ کہنے والا تو ”اکلوتا“ تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ اپنے پُرکھوں کی حویلی میں اکیلا تھا۔ جہاں اس کی مرضی کے بغیر کسی کی آواز نہیں نکلتی تھی۔ اب سناٹا تھا۔ روح کو زخمی کر دینے والی خاموشی مگر اس کے کانوں میں طبل جنگ بج رہا تھا۔ سب جا چکے تھے اس کے خادموں کو اس طرف آنے کی اجازت نہیں تھی۔

یہ سرخ چھوٹی اینٹوں سے بنی ہوئی نوابوں کی حویلی تھی جہاں وہ اکبری جاہ و جلال سے چلتا تھا اب اس کے قدموں میں بے بسی اور جنبش تھی۔ وہ اپنی حویلی کے مرغولی دروں والے برآمدے میں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا تھا۔ اسے آج پہلی بار لگا تھا کہ وہ بوڑھا ہو چکا ہے، اپنے غیض و غضب کے ساتھ۔ سردی میں بھی اس کی پیشانی پر پسینہ تھا وہ بڑی مشکل سے دیوان پر بیٹھ پایا تھا۔ وہ یادوں کے قبرستان میں پہنچ چکا تھا، جہاں پر گیارہ مقبرے تھے۔

”بارہ لوگوں نے مل کر آپ کو فرعون بنایا۔“

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

اس کے کانوں میں آگ کے شعلے بھڑکے۔ اسے یاد آیا ایک مقبرہ بننا بھی باقی تھا۔

نواب جہانگیر ریاست سات بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ نواب ریاست علی کی دوسری بیوی سے تیسری اولاد پہلی بیوی کے ہاں پانچ بیٹیوں کی پیدائش کے بعد ریاست علی کے والدین نے اس کی دوسری شادی کر دی۔ اگر ایسا کہیں تو بہتر ہوگا کہ اس کی پہلی بیوی نے ہی ریاست علی کے والدین کو مجبور کیا تھا کہ اس کے خاوند کی دوسری شادی کی جائے۔ ریاست علی کی دوسری شادی کے بعد بھی اسے اپنی ریاست کا وارث نہیں ملا تھا۔ پہلی دو بیٹیوں کے بعد خدا خدا کر کے ان کے ہاں بیٹے کی پیدائش ہوئی تھی۔ کوئی سائیں، جوگی، پیر، فقیر ایسا نہیں تھا جس سے دُعا نہ کروائی ہو۔ کوئی وید، حکیم، ڈاکٹر نہیں بچا تھا جس سے دوا نہ لی ہو۔

جس دن جہانگیر پیدا ہوا، اُس دن نواب ریاست علی نے اپنے سارے علاقے کی دعوت کی تھی۔ اردگرد کے سارے گوٹھ نواب ریاست علی کی دعوت پر پہنچے تھے۔ وقت گزرتا گیا جہانگیر کے دادا دادی کے انتقال کے بعد بھی اس کے نازخڑے اٹھانے والوں کی کمی نہیں تھی۔

سات بہنیں، دو مائیں اور دسواں نواب ریاست علی۔ جہانگیر کی ہر خواہش حرفِ آخر ہوتی۔ جس کی وجہ سے جہانگیر کی طبیعت اور اس کا مزاج کافی سخت اور گھمنڈی ہو گیا تھا۔ نواب ریاست کے باپ کو انگریز سرکار جاتے جاتے لمبی چوڑی جاگیر عطا کر گئی تھی۔ نواب ریاست علی بھی اکلوتا تھا لہذا شراکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نواب ریاست علی نے اپنی جاگیر کو بچانے کے لیے اپنی ساتوں بیٹیوں کی شادی اپنے سے چھوٹے گھرانوں میں کروائی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی ساری بیٹیوں سے اپنے حصے کی دستبرداری بھی لکھوائی تھی۔

نواب جہانگیر جوان ہو چکا تھا، اب وہ اپنے باپ کی جاگیر کا اکلوتا وارث تھا۔ مغرور، گھمنڈی، خود سر، ضدی ہزار برائیاں تھیں اس کے اندر۔ اس کے شوق بھی راجوں مہاراجوں اور نوابوں جیسے ہی تھے۔ کتوں کی لڑائی، مرغوں کی لڑائی، گھوڑوں کی دوڑ سارے شوق جہانگیر نے پال رکھے تھے۔ شراب اور جوئے کی کمی تھی جو وہ کراچی جا کر پوری کر لیتا۔

ایک بہت بڑی خوبی اس کے اندر تھی، اس نے گوٹھ کی کسی بہو بیٹی کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ ایک دن کراچی کسی کام سے وہ اپنی ماں کے دُور کے رشتے داروں کی طرف گیا تھا جہاں اس کی نظر عابدہ پر پڑی۔ گھر آ کر اس نے فیصلہ سنا دیا کہ وہ شادی کرے گا تو صرف اسی لڑکی سے۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

نواب ریاست علی اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر غفور احمد کے ہاں پہنچے تھے۔ غفور ہائی اسکول میں ماسٹر تھا۔ غفور کے بچوں میں عابدہ بڑی تھی اور میٹرک پاس بھی، ماسٹر غفور اسے آگے پڑھانا چاہتے تھے مگر عابدہ سلامتی کڑھائی اور خانہ داری میں زیادہ خوش رہتی جس وجہ سے اس کے باپ نے آگے پڑھنے پر زیادہ زور نہیں ڈالا تھا۔

”ماسٹر...! میں اپنے جہانگیر کا رشتہ لے کر آیا ہوں۔“ نواب ریاست علی نے رشتہ ایسے مانگا جیسے اعلان کر کے فیصلہ سنایا ہو۔

”نواب صاحب...! آپ بڑے ہیں، عمر میں بھی اور مرتبے میں بھی۔ میرا آپ کا کیا جوڑ؟“ ماسٹر غفور نے مسکراتے ہوئے بات گول کرنی چاہی۔

”وہ تو ٹھیک ہے پر جہانگیر کی ضد ہے کہ شادی وہ تمھاری بیٹی ہی سے کرے گا۔“

ماسٹر غفور کافی دیر نظریں جھکائے سوچتا رہا پھر ہمت کر کے بول ہی پڑا:

”نواب صاحب...! سچ بات تو یہ ہے کہ میں یہ رشتہ کرنا ہی نہیں چاہتا۔“ ماسٹر غفور نے گردن جھکائے ہی دہ لفظوں میں دل کی بات کہہ دی۔

”تمھارا دماغ تو ٹھیک ہے غفور...! میں خود نواب ریاست علی اپنے اکلوتے بیٹے کا رشتہ لے کر آیا ہوں۔“ نواب ریاست علی نے گرج دار آواز میں اپنی حیثیت اور مقام یاد دلایا۔

”تم ایک معمولی ماسٹر ہو اور کرائے کے مکان میں رہتے ہو۔ میرا بیٹا میری جاگیر کا اکلوتا وارث ہے۔“

”اکلوتا وارث...!!! یہی تو نواب صاحب میری بیٹی بھولی اور معصوم ہے اور آپ کا اکلوتا بیٹا مغرور اور غصے والا ہے... یہ بے جوڑ رشتہ ہے۔ میرا تجربہ ہے اکلوتا بیٹا بھی بگڑ جاتا ہے اور زیادہ بہنوں کا بھائی بھی بگڑا ہوتا ہے اور آپ کے بیٹے میں دونوں خوبیاں موجود ہیں... میں یہ رشتہ نہیں کر سکتا۔“

ماسٹر غفور نے عاجزی سے انکار کر دیا، نواب ریاست علی کو غصہ تو آیا مگر وہ بھی یہ رشتہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ صرف بیٹے کی ضد کی خاطر یہاں پہنچا تھا۔ جب یہ خبر جہانگیر تک پہنچی تو اس نے آسمان سر پر اٹھالیا تھا:

”اگر عابدہ سے میری شادی نہ ہوئی تو پھر کسی کی بھی نہیں ہوگی۔ میں ہر اُس لڑکے کو ہی ماردوں کا جو اس سے منسوب ہوگا۔“

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

جہانگیر نے ماسٹر غفور کے گھر جا کر سیدھی دھکی دی تھی۔ ماسٹر غفور ٹھہرا شریف آدمی اس نے مجبوری میں ہاں کر دی۔ جہانگیر اور عابدہ کی شادی کو تین ماہ ہی گزرے تھے کہ نوابوں کو نئے وارث کی فکر پڑ گئی تھی۔ جہانگیر کی دونوں مائیں اور ساتوں بہنوں میں سے جو بھی میکے آئی ہوتی وہ یہ بات عابدہ سے لے کر بیٹھ جاتیں:

”کب تم اس گھر کو وارث دو گی؟“

جہانگیر کے مزاج میں شادی کے بعد بھی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی بلکہ وہ پہلے سے زیادہ خود سر اور بد لحاظ ہو گیا۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ عابدہ کی ماں بہن ایک کر دیتا۔ شادی کو تین سال گزر گئے تھے۔ ریاست علی نے جہانگیر کی حیدر آباد میں اپنے ہم پلہ خاندان میں دوسری شادی کر دی تھی۔ جہانگیر کی دوسری بیوی نے شادی کے دس دن بعد ہی خلع کے لیے عدالت سے رجوع کر لیا تھا۔ جہانگیر نے اپنی دوسری بیوی کو طلاق دے دی۔ اس کا غصہ بھی عابدہ پر ہی نکلا تھا۔

”تمہاری وجہ سے نیلو فر نے مجھ سے طلاق لی ہے۔“ جہانگیر نے ساری ذمہ داری عابدہ پر ڈال دی۔

”آپ خود اس کے ذمہ دار ہیں۔“ عابدہ کی زبان پر لگا خاموشی کا تالا آخر کھل ہی گیا تھا۔ ادھر عابدہ کی زبان کھلنے کی دیر تھی جہانگیر کا ہاتھ بھی اٹھ گیا، پھر ایسا اٹھا کہ کبھی قابو میں نہ آیا، جہانگیر نے اس دن عابدہ کو بہت مارا تھا۔

”آپ جیسے فرعون کے ساتھ کوئی بھی عورت گزارہ نہیں کر سکتی۔“ عابدہ کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی ہوئی بول رہی تھی، اس کے ہونٹوں سے لہورس رہا تھا۔

جہانگیر کے کمرے سے باہر جاتے ہوئے قدم رک گئے تھے۔ وہ پلٹا اور فرش پر پنچوں کے بل بیٹھ گیا۔ عابدہ کو گردن پر بکھرے ہوئے بالوں سے پکڑا اور جھٹکے سے اس کی جھکی ہوئی گردن کو سیدھا کیا اور دائیں ہاتھ سے اپنی مونچھوں کو تالا دیا پھر بولا:

”فرعون کو بھی اللہ ہی نے پیدا کیا تھا۔“

”نا... نا... نواب صاحب...! وہ تو انسان ہی پیدا کرتا ہے۔ انسان خود ہی فرعون بن جاتا ہے۔ نبوت

کا ظہور بھی انسانی شکل ہی میں ہوتا ہے۔“ عابدہ نے جہانگیر سے آنکھیں ملا کر جواب دیا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

جہانگیر نے ایک زوردار طمانچہ اسی لمحے عابدہ کو جڑ دیا پھر یہ اکثر ہونے لگا۔ عابدہ کی زبان کھلتی اور جہانگیر کا ہاتھ اٹھتا۔ خدا کی کرنی چند دنوں بعد پتہ چلا عابدہ جہانگیر کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ شادی کے تقریباً چار سال بعد نوابوں کو اپنی جاگیر کا وارث مل ہی گیا۔

نواب ریاست علی نے اپنے پوتے کا نام نواب حارث علی رکھا۔ اس کی تربیت بھی جہانگیر کی طرز پر کی جا رہی تھی جو کہ عابدہ کو منظور نہ تھا۔ عابدہ نے اپنے بیٹے کی اچھی تربیت کے سارے جتن کیے تھے۔ چند سال بعد نواب ریاست علی اور اس کی دونوں بیویوں کو اپنی دنیا پر بنائی ہوئی ریاست چھوڑنے کا حکم مل گیا۔ نواب ریاست آگے چلا گیا اور اس کی ریاست پیچھے رہ گئی۔ اس ریاست کا اب سیاہ سفید کا مالک جہانگیر ہی تھا۔ وہ اپنے شوق پورے کرنے کے لیے زمین پر بینکوں سے قرض لیتا رہا۔ پھر نوبت یہ آن پڑی کی بینکوں کا قرض اتارنے کے لیے اپنی زمین بیچنا شروع کر دی تھی۔

عابدہ نے عقلمندی دکھائی اور جیسے تیسے کر کے اپنے بیٹے کو ولایت پڑھنے کے لیے بھیج دیا۔ حارث جوانی کی سیڑھیاں چڑھتا رہا اور جہانگیر بڑھاپے کی سیڑھیاں اترتا گیا۔ وقت کی اس گردش میں حارث کی ساتھ پھوپھیوں میں سے چھ جوانی کے مینار چھوڑ کر موت کے مقبروں میں دفن ہو گئیں۔

نواب حارث علی ولایت سے ڈاکٹر حارث علی بن کر لوٹا۔ ڈاکٹر حارث علی کراچی کا ایک مشہور سائیکاٹرسٹ تو تھا ہی، اس کی قابلیت کا چرچا بھی تھا۔ جہانگیر کی جاگیر میں جان باقی نہ رہی۔ ریاست میں سے ست (رس) نچوڑ لیا گیا، بس نام کی نوابی تھی۔ چند مربیعے زمین کے وہ بھی کچھ گروی تھے باقی ٹھیکے پر۔ چند ایکڑ زمین جہانگیر کے پاس بچی تھی۔ جہانگیر پہلے کراچی جا کر شراب اور جوئے سے فیض یاب ہوتا تھا۔ اب اس نے یہ کام اپنے گھر میں ہی شروع کر دیا۔ جہانگیر کی زبان اور ہاتھ بھی اس کے قابو میں نہ تھے۔ وہ بڑھاپے کے باوجود عابدہ کو مارتا، اسے ننگی گالیاں دیتا۔ جب عابدہ اسے لاجواب کر دیتی تو وہ اسے اور مارتا۔ عابدہ نے اس سے بدتمیزی کبھی نہیں کی تھی۔

حارث نے کئی بار اپنے باپ کو سمجھایا کہ اب بس کرے میری ماں کی ہڈیاں بہت کمزور ہو گئی ہیں۔ ایک دن حارث اپنی شادی کی بات کرنے کے لیے کراچی سے گوٹھ آیا۔

”اباجی...! حدیث کا مفہوم ہے: بدترین ہیں وہ انسان جو عورتوں کو مارتے ہیں۔“ حارث نے ادب کے ساتھ اپنے باپ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”میں نے ساری زندگی اپنے باپ نواب ریاست علی کو کچھ نہیں سمجھایا اور تو مجھے سمجھا رہا ہے۔“

جہانگیر کو اپنے بیٹے کی کہی ہوئی بات ناگوار گزری تھی۔

”سمجھانے والا کام تو دادا جی نے بھی نہیں کیا تھا۔“

”تو اپنی بکواس بند کر اور دفع ہو جا یہاں سے۔ حرام زادے... بے غیرت... کنجری کے بیٹے... تو نے دودھ ہی گندی ماں کا پیا ہے۔“ جہانگیر غصے سے چلایا۔

”اباجی...! آپ صرف نام کے ہی نواب ہیں۔ اور کچھ نہیں تو نوابوں کی تہذیب اور تمیز ہی سیکھ لیتے۔“

حارث کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے۔ جہانگیر نے وہ کیا جو وہ اس کی ماں کے ساتھ ہمیشہ سے کرتا آرہا تھا۔ جہانگیر نے جوان بیٹے کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ عابدہ نے آگے بڑھ کر جہانگیر کو روکا۔ اس نے غصے سے اسے بھی دھکا دے دیا تھا۔ اگلے دن حارث پھر اپنے باپ کے پاس پہنچا اور کہنے لگا:

”میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ میرے ساتھ چلیں اور لڑکی کے گھر والوں سے بات کریں۔“

”کون ہیں وہ لوگ؟“ جہانگیر نے روکھے انداز میں پوچھا۔

”میمن ہیں، لڑکی ڈاکٹر ہے، میرے ساتھ پڑھتی تھی۔“

”فیصلہ خود کیا اور عمل درآمد مجھ سے کروانا چاہتے ہو۔ میں نہیں جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے میں ماں جی کو اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔“

”ہرگز نہیں...! وہ میری اجازت کے بغیر کیسے جاسکتی ہے آخر میں اس کا مجازی خدا ہوں۔“

”آپ مجازی خدا نہیں... آپ تو میری ماں کے خدا بن بیٹھے ہیں۔“

”یہ تمیز سیکھی ہے تم نے ولایت جا کر، رات کو بکواس کر رہے تھے کہ مجھے تمیز نہیں ہے۔“ جہانگیر نے غصے سے کہا۔

”اباجی...! میں معذرت چاہتا ہوں، میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا، میں تو کہنا چاہ رہا تھا کہ انسان کو اپنی عمر کے حساب سے بدل جانا چاہیے۔ اب آپ بزرگ ہیں ماں جی کو گالیاں دیتے اور مارتے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔ تھوڑی چمک پیدا کریں اپنے رویے میں۔ آپ دونوں میرے ساتھ کراچی چلیں۔“

”اب میں آخری عمر میں اپنے پُرکھوں کی حویلی چھوڑ کر تمہارے گھونسلے میں جا بیٹھوں... جہانگیر

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

ٹوٹ سکتا ہے کسی کے آگے جھک نہیں سکتا۔“

”ابا جی...! گستاخی معاف...! جھکنے والوں کو ہی دنیا میں عزت ملی ہے۔ آپ صرف اللہ کے سامنے سجدے میں گر جائیں۔ ساری دنیا آپ کے تابع ہو جائے گی اور آپ کی تابعداری کرے گی اور ان میں سے آپ کا یہ بیٹا سب سے آگے ہوگا۔ ابا جی...! نہ آپ کو اپنا پہلا سجدہ یاد ہوگا اور نہ ہی آخری یاد ہے۔“

”تو ڈاکٹر ہے کہ مولوی۔ نہ تو مجھے تجھ سے نصیحتیں سننی ہیں اور نہ ہی عاجزی کی دوا لینی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تو میرا خون ہی نہیں ہے۔“

”نواب صاحب...! اگر یہ بات کوئی اور کہتا تو میں مسیحا سے جلاد بن جاتا۔ میری ماں کے خاوند نے مجھے اور میری ماں کو ایک ساتھ گالی دی ہے۔“ حارث نے بڑے اعلیٰ ظرف کا مظاہرہ کیا پر وہ زخمی لہجے میں بولا تھا۔

”ماں جی...! آپ میرے ساتھ چلیں!“

عابدہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش جاری تھی۔ اس نے حقارت سے جہانگیر کی طرف دیکھا۔ وہ خاموشی سے اپنے بیٹے کے پیچھے چل دی تھی۔

”عابدہ...! اگر تم نے اس گھر سے قدم باہر نکالا تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔“

جہانگیر کو اپنی کہی ہوئی کسی بات پر پشیمانی نہیں تھی۔ الٹا اس نے عابدہ کو دھمکی دے دی۔ عابدہ کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے تھے۔

”ماں جی...! ایسی ذلت سے طلاق ہزار گنا بہتر ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ نواب صاحب آپ طلاق دے دیں۔“ حارث نے پیچھے مڑ کر اپنے والدین کو مخاطب کیا تھا۔

”حارث بیٹا...! یا انسان بہادر ہوتا ہے... نہیں تو ڈرپوک...! میں ڈرپوک ہوں، نیلوفر بہادر تھی، اس نے دس دن بعد ہی اپنے فرعون کو دریائے نیل میں ڈبو دیا تھا اور میں چونتیس سال سے پچھڑے کی پوجا کر رہی ہوں۔ حارث بیٹا...! تم جاؤ میری ہجرت کا وقت ابھی نہیں آیا۔“

حارث جس بات سے بے خبر تھا وہ بھی اسے پتہ چل گئی کراچی لوٹنے سے پہلے گھر کے ایک ملازم

سے۔

چند دن بعد حارث نے شادی کر لی تھی پھر ایک دن جہانگیر نے عابدہ کو بہت مارا جس کی وجہ سے وہ

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
بستر کے ساتھ چمٹ کے رہ گئی۔ جہانگیر نے حارث کو اس کی ماں کی بیماری کی اطلاع نہیں دی تھی۔ اس دور
میں ٹیلی فون کی سہولت بھی بہت کم لوگوں کو میسر تھی۔ چند دن بعد حارث اپنی بیوی کے ساتھ خود ہی آیا تھا۔
عابدہ شاید اپنے بیٹے کا ہی انتظار کر رہی تھی۔

جس شام حارث گھر پہنچا اسی رات عابدہ اگلے جہاں پہنچ گئی۔ حارث کو اپنی ماں کے جسم پر لگے
ہوئے ظلم کے ٹھپے نظر آ گئے تھے۔ عابدہ نے اپنے بیٹے کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ اگلے دن حارث نے اپنی ماں کی
تدفین کی، بہت بڑا جنازہ ہوا تھا۔ عابدہ کی وفات پر ہر آنکھ اشک بارتھی۔ دوپہر کے بعد حارث کراچی جانے
کے لیے تیار تھا۔ وہ اپنی بیوی کو گاڑی میں بٹھا کر اپنے باپ کو الوداعی سلام کہنے کے لیے اپنی حویلی کے صحن
میں داخل ہوا تھا، جہانگیر نے حارث کو دیکھا تو تمام ملازموں کو جانے کا حکم صادر کر دیا۔
”کوئی ادھر نہ آئے جب تک میں نہ بلاؤں۔“

”نواب صاحب...! چلتا ہوں۔“ حارث نے اپنے آنسو صاف کیے اور پلٹ گیا جانے کے لیے۔
”پھر کب آؤ گے؟“ جہانگیر نے اپنی خرراہٹی آواز میں پوچھا۔
”کبھی نہیں۔“ حارث نے دھیمے سے جواب دیا۔

”اپنی ماں کا جنازہ دیکھ کر... لوگوں کی آنکھوں سے گرتے آنسو میری ماں کی عظمت کا ثبوت تھے
نواب صاحب...! دودھ اور خون...“ حارث بات کرتے کرتے رُک گیا۔ اسے مناسب الفاظ نہیں مل رہے
تھے۔ وہ اپنی ماں کی طرح باادب تھا۔ اس کی ماں نے ہمیشہ اس کے باپ کو لا جواب کیا تھا مگر ادب کی رسی
ہاتھ سے نہیں چھوٹی۔

”میری ماں کب... میری ماں عابدہ تھی... نام کی بھی اور کردار کی بھی۔“ حارث کوشش کے باوجود بھی
کنجری نہیں کہہ سکا تھا۔

”نواب صاحب...! آج میں آپ کے سامنے گردن جھکائے کھڑا ہوں یہ میری ماں کے دودھ ہی کا
اثر ہے۔ آپ کے بقول میرا خون تو... خیر چھوڑیں... یہاں سے جانے کے بعد میں آپ کی دوسری بیوی نیلوفر
سے ملا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے نواب جہانگیر سے طلاق کیوں لی...؟ انھوں نے جواب دیا
کیوں کہ میں عابدہ نہیں تھی۔ انھوں نے آپ کی اصلیت مجھے بتائی۔ آپ نے خود کہا تھا میری رگوں میں آپ
کا خون نہیں ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ جہاں تک میری بات ہے میری نظروں میں میری ماں اللہ اور اُس

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

کے رسول کے بعد سب سے زیادہ معتبر ہے۔ آپ کے بقول:

”اگر میں حرام زادہ بھی ہوا پھر بھی میری نظروں میں میری ماں کے مرتبے اور مقام میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔“

آج کے بعد میرے اور آپ کے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میری ماں جسے مجازی خدا سمجھتی رہی وہ تو فرعون تھا۔ بارہ لوگوں نے مل کر آپ کو فرعون بنایا تھا۔“

نواب حارث علی... ڈاکٹر حارث علی بن کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نوابوں کی حویلی سے چلا گیا۔ ایک اکلوتا دوسرے اکلوتے کوتہا چھوڑ گیا تھا۔ ڈاکٹر حارث کے جانے کے بعد جہانگیر خود اپنی لاش کو گھسیٹ گھساٹ کر اپنے کمرے میں پہنچا تھا۔ اگلی صبح جب خادم نواب جہانگیر ریاست کے کمرے میں گیا تو وہ دیوان پر ٹیک لگائے کھیتوں کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے باہر کھلی آنکھوں کے ساتھ اپنی جاگیر کو دیکھ رہا تھا۔ وہ الگ بات ہے تب آنکھوں میں نور نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

جامین

کئی سال پہلے کی بات ہے، شکر گڑھ کے نواحی گاؤں سے ایک نوجوان جامین اپنے ٹھیکیدار کے ساتھ بلوچستان کے ایک علاقے میں گیا، وہاں پر اُس کے ٹھیکے دار کو سڑک بنانے کا ٹھیکہ ملا تھا۔ سڑک کی تعمیر کے دوران چھوٹی عید آن پہنچی، جامین عید اپنے گاؤں کرنا چاہتا تھا مگر طالب حسین نہیں مانا۔

”اُستاد...! تو بھی کمال کرتا ہے نہ تو خود گھر گیا ہے اور نہ ہی مجھے جانے دے رہا ہے۔“ جامین شکایتی انداز میں بولا۔

”اُوئے جامین...! ناتیری رن اور نہ ہی بچے... تو گاؤں جا کر کیا کرے گا۔ یہاں ساتھ والے قصبے میں اپنا ٹھیکے دار ساجد بلوچ رہتا ہے۔ عید پر اُس کے پاس چلیں گے۔ یہ بلوچی بڑی خدمت کرتے ہیں تین چار دن وہاں مزے کریں گے۔“

عید کے دوسرے دن جامین قصبے میں مٹر گشت کر رہا تھا۔ اچانک اُسے ایک گھر کے ساتھ ملحقہ باڑے سے ایک میٹھی آواز سنائی دی۔ کسی لڑکی کی آواز تھی جو کہ خود ایک بڑی سی چادر میں لپیٹی ہوئی تھی۔ صرف اُس کے دودھیا ہاتھ اور نیلی آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ وہ کچھ بول رہی تھی جو جامین کی سمجھ سے باہر تھا۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے جامین کو اپنی طرف بلایا، جامین نے حیرت سے اپنے پیچھے مڑ کر دیکھا وہ اُسے ہی بلا رہی تھی۔

جامین کی سمجھ سے باہر تھا آخر ماجرا کیا ہے، جامین گھبرا رہا تھا اور وہ لڑکی پریشان تھی۔ جامین ہمت کر

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

کے اُس کے پاس چلا ہی گیا، وہ بلوچی زبان میں اُس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ جو جاین کی سمجھ سے باہر تھا۔ جب جاین کی نظر اُس لڑکی کے ہاتھ میں بڑے سے چہرے پر پڑی تو اُس پر لرزہ طاری ہو گیا، وہ کئی کتر اکڑواہاں سے کھسکنا چاہ رہا تھا۔ لڑکی کو اُس کے ارادوں کی بھنگ لگ گئی تھی۔

لڑکی نے دودھیارنگت والے روئی کی طرح نرم دائیں ہاتھ سے جاین کی مضبوط کلائی تھامی اور اندر باڑے میں لے آئی اور اپنے بائیں ہاتھ میں تھامے ہوئے چہرے کو سامنے کی طرف کر دیا، جب جاین نے چہرے کی سمت کی طرف دیکھا تو ایک مچھڑا تڑپ رہا تھا۔

اس دوران لڑکی کی چادر اُس کے چہرے سے ہٹی۔ جاین دیکھتا ہی رہ گیا چودھویں رات کا چاند بدلیوں کو چیر کر باہر نکلا تھا۔ جاین نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ پر اس سے زیادہ حسین چہرہ اُس نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ جاین دودھ سے زیادہ سفید چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ جگنو کی طرح چمکتی پیشانی موٹی موٹی نیلی آنکھیں، دودھیارنگت، تیکھی ٹھوڑی، سرخ گلاب کی پتیوں جیسے رخسار۔ جاین مچھڑے کی بجائے اُس پری زاد کو چشمِ اُلفت سے دیکھ رہا تھا۔ اُسی لمحے جاین کے دل سے دُعا نکلی:

”یا مولا...! اسے میری بنا دے۔“

پری زاد نے دوبارہ جاین کو کلائی سے پکڑا تو جاین تخیل کی دنیا سے واپس لوٹا، اب کی بار وہ پری زاد اُسے مچھڑے کے پاس ہی لے گئی تھی اور چہرے کو جاین کے حوالے کرتے ہوئے اُسے اشارے سے سمجھایا۔ اسے ذبح کر دو۔

جاین کو ساری بات سمجھ آ گئی تھی۔ وہ پری زاد تڑپتے ہوئے مچھڑے کو حرام ہونے سے بچانے کے لیے حلال کروانا چاہتی تھی۔ جاین نے جلدی سے چہرا پکڑا اور مچھڑے کو ذبح کر دیا۔ پہلی بار پری زاد نے جاین کو غور سے دیکھا تھا۔ اسے لگا یہ اس علاقے سے نہیں ہے۔

”آ... آپ اس کا گو... گوشت بنا سکتے ہیں؟“ بلوچی لڑکی نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

جاین نے چشمِ اُلفت کی بجائے حیرت سے اُس لڑکی کی طرف دیکھا تھا۔ اُس نے سوچا یہ پری تو اُردو بھی بولتی ہے۔ جاین اُس سے بات کرنا چاہتا تھا مگر گلا خشک تھا۔ اُس نے حلق کا لعاب اندر نگلا اور بڑی مشکل سے گردن کو ہاں میں جنبش دی۔ جاین موسمی قصائی بھی تھا۔ جو بہت سارے لوگوں کی طرح عمید قربان پر قصائی کا کام بھی کرتا تھا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

جائین ہر طرح کی مزدوری کرتا رہا تھا۔ وہ کام کرنے سے پہلے معاوضہ طے کر لیتا تھا۔ اُس دن وہ اپنے کام میں مشغول تھا معاوضے کی فکر کیے بغیر۔ وہ لڑکی تھوڑی دیر وہاں کھڑی رہی۔ اُس کے بعد اُس نے جائین کو سب کچھ مہیا کر دیا تھا جو گوشت بنانے کے لیے درکار ہوتا ہے۔

اس دوران اُن دونوں میں مزید کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ جائین کے چت (دل) میں چور آچکا تھا، وہ چورنگا ہوں سے اُسے دیکھتا رہا، وہ اُس سچل موتی کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لڑکی نے بھی جائین کو نیلی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اُن نیلی جھیل جیسی آنکھوں کے اندر کئی راز تھے۔ جن سے جائین کچھ اخذ نہیں کر پارہا تھا۔ سارا کام ختم کرنے کے بعد جائین وہاں سے نکل آیا چپ چاپ۔ اس لڑکی نے جائین کا شکریہ ادا کیا اور صرف یہ پوچھا:

”تم کہاں ٹھہرے ہو؟“

اگلے دن تڑکے ہی تڑکے ایک شخص عمر پچاس کے آس پاس جائین کو ڈھونڈتا ہوا ساجد بلوچ کے ڈیرے پر پہنچا تھا۔

”تمہارے مہمان نے میرا نقصان کیا ہے۔“ عطاء اللہ بلوچ نے غصے سے کہا۔

طالب حسین اور جائین نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھا تھا، وہ دونوں ناشتہ کر رہے تھے۔ جو ساجد اُن کے لیے لے کر آیا تھا۔ ساجد نے عطاء اللہ کو ایک طرف لے جا کر معلومات لی تو پتہ یہ چلا کہ وہ بچھڑا عطاء اللہ کا تھا۔ عطاء اللہ بچھڑے کی قیمت مانگ رہا تھا، جب کہ جائین انکاری تھا۔ عطاء اللہ مرنے مرانے پر آگیا تھا۔ قصہ مختصر عطاء اللہ ہی نے کہا:

”سردار!... جو بھی فیصلہ کر دے گا مجھے منظور ہوگا۔“

وہ چاروں سردار کے روبرو پیش ہو گئے تھے۔ بوڑھا بلوچ سردار ایک زیرک شخص تھا۔ اُس نے پہلے عطاء اللہ کی ساری بات سنی پھر اُسے مشورہ دیا:

”عطاء اللہ!... یہ بات تو ٹھیک ہے کہ اس لڑکے نے تمہاری اجازت کے بغیر تمہارا بچھڑا ذبح کر دیا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو بچھڑا مر جاتا۔ پھر یہ چھ ہزار بھی نہ ملتے جو قصائی کو گوشت دے کر حاصل ہوئے ہیں۔“

”سردار!... مجھے پورے اٹھارہ ہزار ہی چاہیے۔ وہ بچھڑا چند روز پہلے ہی میں نے قربانی کے لیے

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

خریدا تھا۔“ عطاء اللہ نے فیصلہ سننے سے پہلے ہی اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا تھا۔

بوڑھے سردار کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

”عطاء اللہ...! ہر دفعہ تمہاری مرضی کے مطابق فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ یہ لڑکا ہمارا پاکستانی بھائی ہونے

کے ساتھ ساتھ ہمارا مہمان بھی ہے۔ اس کے ساتھ انصاف ہوگا۔“

جائین کے چہرے پر گھبراہٹ ڈیرے ڈالے ہوئی تھی۔ بلوچ سردار نے جائین کی طرف دیکھا اور

میٹھی زبان میں بولا:

”بیٹا...! تمہارا نام کیا ہے؟“

”جائین!“ جواب ملا۔

”جائین...! یہ کیسا نام ہے، کیا مطلب ہے اس کا؟“ سردار نے حیرت سے پوچھا۔

”مطلب جی... وہ تو پتہ نہیں۔“

”مسلمان ہو؟“

”ہاں...! ہاں...! جی۔“ جائین نے بلبلاہٹ میں کہا۔

”تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟“

”محمد امین!“ جائین نے جلدی سے جواب دیا۔ بلوچ سردار نے ہلکا سا تہقہہ لگایا، پھر کہنے لگا:

”تمہارا سیدھا نام کیا ہے؟“

”جمال امین... مگر سب لوگ مجھے جائین ہی کہتے ہیں۔“

اُس کے بعد بلوچ سردار نے جائین کے متعلق سب کچھ پوچھا، اُس کے خاندان کے بارے میں،

اس کے گھر کے بارے میں، اس کی ازدواجی حیثیت کے متعلق سب سے آخر میں پچھڑے کو ذبح کرنے کی وجہ

بلوچ سردار ایک دفعہ پھر عطاء اللہ سے مخاطب ہوا:

”عطاء اللہ...! فیصلہ نہ کرو اور اس لڑکے کو اس کی غلطی کی معافی دے دو۔“

”نہیں سردار...! آپ فیصلہ ہی کرو۔“ عطاء اللہ بضد تھا۔ بلوچ سردار کے چہرے پر سنجیدگی بڑھ گئی

تھی۔

”ٹھیکے دار...! تمہارے پاس اس لڑکے کے کتنے پیسے جمع ہیں؟“ سردار نے طالب حسین کو سنجیدگی

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

سے مخاطب کیا، طالب حسین بلوچ سردار کا جلالی انداز دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔

”جی وہ کوئی آٹھ دس ہزار ہوگا، ابھی حساب نہیں کیا۔“ طالب حسین نے ہکلاتے ہوئے جواب

دیا۔

”کل تم اٹھارہ ہزار روپیہ لے کر یہاں آؤ۔“

طالب حسین کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ جاوین بُت بنا سردار کو حیرت سے دیکھ رہا تھا، ساجد کے چہرے پر پریشانی بڑھ گئی۔ عطاء اللہ کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھری تھی۔ کافی دیر وہاں خاموشی رقص کرتی رہی۔ جاوین نے ہمت کر کے آواز نکالی۔

”سردار بابا! مجھے آپ کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہے... مگر...“

”مگر... مگر کیا؟“ سردار نے ٹولتی نظروں سے پوچھا۔

”میں مانتا ہوں میں نے غلطی کی، مجھے عطاء اللہ کا کچھڑا ذبح نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر ان کی بیٹی مجھے مجبور نہ کرتی تو میں ایسا کبھی نہ کرتا۔“

”وہ میری بیوی ہے... بیٹی نہیں۔“ عطاء اللہ آگ بگولہ ہوا تھا۔

جاوین نے آگ اگلتے ہوئے عطاء اللہ کو سرتا پیر غور سے دیکھا۔ کالی رنگت، چہرے پر ماتا کے داغ، دانت پیلے، توند نکی ہوئی، بڑھاپے کی دلیلیں کے اوپر کھڑا ہوا عطاء اللہ بلوچ۔

”وہ تمھاری بیوی ہے؟“ جاوین نے دوبارہ پوچھا۔ اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

”ہاں!... وہ میری بیوی ہے۔“ عطاء اللہ نے کھا جانے والی نظروں سے جاوین کو دیکھا جو بہت غصے

میں تھا۔

”عطاء اللہ!... تم اپنے غصے کو قابو میں رکھا کرو۔ یہ تمھارا گھر نہیں ہے۔ یہ میرا ڈیرہ ہے۔“ سردار

نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ سردار کو عطاء اللہ کی تلخی پسند نہ آئی تھی۔

عطاء اللہ نے سردار کی طرف دیکھا تو شرمندگی سے گردن جھکا لی۔ عطاء اللہ کی وہ لڑکی تیسری بیوی تھی جو کہ اُس نے اپنے گھر سے دور الگ گھر میں رکھی تھی۔ عطاء اللہ ایک کھاتا پیتا آدمی تھا۔ پہلی بیوی کے مرنے کے بعد اُس نے دوسری شادی کر لی تھی اور تیسری شادی کو چھ ماہ ہی گزرے تھے۔

”اب تم سب جاسکتے ہو۔ عطاء اللہ!... کل تم اپنی بیوی کو بھی لے کر آؤ۔ وہ اندر زنان خانہ میں

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

بیٹھ گئی اور ٹھیکے دار تم اٹھارہ ہزار ساتھ لے کر آنا۔“

ساجد بلوچ کے ڈیرے پر آنے کے بعد جاین نے پروگرام بنایا کہ وہ اس علاقے سے بھاگ کر کوئٹہ چلا جائے گا اور کوئٹہ سے لاہور کی ٹرین پکڑ کر لاہور اور وہاں سے شکر گڑھ۔ ساجد کو اُس کے ارادے کی خبر ہو گئی تھی۔ اُس نے کہا:

”پورے بلوچستان میں کسی کی مجال نہیں ہے کہ وہ سردار سے بھاگ سکے یا اُس کا کیا ہوا فیصلہ ماننے سے انکار کر دے۔ تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ تم اٹھارہ ہزار دے دو۔“

”ساجد بھائی...! کیسے دے دوں؟ میں غریب آدمی ہوں۔ دو ماہ کے بعد یہ رقم اکٹھی ہوئی ہے۔ بڑی عید کے بعد میری بہن کی شادی ہے۔ ابا میرا بیمار رہتا ہے۔ چھوٹے بہن بھائی پڑھ رہے ہیں، زندگی میں پہلی بار کوئی کام پیسوں کے بغیر کیا تھا۔ تمہارا بڈھا سردار بھی سمجھ سے باہر ہے۔ چھ ہزار تو اس کو مل گئے ہیں، بارہ ہزار لینے کی بجائے (ٹھیکے دار تم اٹھارہ ہزار ساتھ لے کر آنا)“ جاین نے بلوچ سردار کی نقل اتاری تھی اسی کے انداز میں۔

”اُستاد...! میں یہاں سے بھاگ رہا ہوں، تم پیسے مت دینا۔ (یہ بلوچی بڑی خدمت کرتے ہیں) اس بار رونے والی شکل بنا کر جاین نے طالب حسین کی بھی نقل اتاری تھی۔

”میری خدمت تو بلوچیوں نے کر دی۔ تم اپنی خیر مناؤ۔“ جاین نے کہا۔

”اتنا بڑا پچھڑا میں نے اکیلے ہی بنایا لاہور میں عید کے دنوں میں اتنا بڑا جانور ذبح کرنے کے اچھے خاصے پیسے ملتے ہیں۔ چائے پانی الگ سے پلاتے ہیں۔ اس لڑکی نے چائے پانی کا بھی نہیں پوچھا۔ سردی ہے چلو چائے ہی پلا دیتی۔ کچھ بھی ہو جائے میں ایک روپیہ نہیں دوں گا۔“ جاین نے اپنے ارادے ظاہر کیے تھے۔

”جاین...! یہ لاہور نہیں ہے، بلوچستان ہے۔ یہاں پر عورتیں غیر مردوں کو چائے پانی نہیں پوچھتیں۔ گھر میں کوئی مرد ہوتا تو وہ تمہاری لاہور والوں سے زیادہ خاطر مدارت کرتا۔“

ساجد بلوچ اور طالب حسین کی ملاقات کوئٹہ ریلوے اسٹیشن پر ہوئی تھی۔ کچھ سال پہلے جب ساجد کسی کام کے سلسلے میں لاہور گیا تھا۔ دونوں کی سیٹیں ساتھ ساتھ تھیں۔ ساجد بلوچ کو چھوٹے موٹے سرکاری ٹھیکے مل جاتے تھے۔ اس نے طالب حسین کو بھی اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اس سڑک کا ٹھیکہ بھی ساجد کو ہی ملا تھا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

اس نے طالب حسین کو بھی بلا لیا تھا۔ جاین طالب حسین کا دور کا رشتہ دار تھا۔ ساجد کو جاین کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا احساس تھا مگر وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

”طالب حسین...! تم جاین کا حساب کرو جو بھی نقصان ہوا ہم تینوں برابر تقسیم کر لیں گے۔“

طالب حسین نے اپنے بستے سے کاپی پینسل نکال لی تھی۔ جاین سے حساب کرنے کے لیے جاین اب بھی کچھ گم سم تھا۔ اسے ساجد کی بات سن کر بھی کوئی خاص خوشی نہ ہوئی تھی۔

”ساجد بھائی...! وہ لڑکی سچ میں اس کی بیوی ہے؟“

”ہاں...!“ ساجد نے مختصر سا جواب دیا اور جاین کے چہرے پر اپنی نظریں جمادیں جہاں پر عجیب سے تاثرات تھے۔

”جاین...! ادھر میری طرف دیکھو!“ ساجد نے جاین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی تھی۔ طالب حسین بے نیازی سے حساب کتاب میں مصروف تھا۔

”عطاء اللہ اور رحیم بخش دوست تھے۔ رحیم بخش کی بیوی ماں بننے والی تھی۔ یہاں کی دائی بولی اگر بیوی کی جان بچانی ہے تو اسے شہر لے جاؤ۔ شہر کے ڈاکٹروں نے بڑے آپریشن کا بول دیا تھا۔ رحیم بخش غریب آدمی تھا۔ وہ پہلے ہی عطاء اللہ کا مقروض تھا۔ اُسے عطاء اللہ سے مزید قرض لینا پڑا، آپریشن کے دوران رحیم بخش کی بیوی مر گئی تب پری گل پیدا ہوئی تھی۔ اب رحیم بخش کی بیٹی پری گل عطاء اللہ کی تیسری بیوی ہے۔“ ساجد نے ساری تفصیل بتائی۔

جاین پریشان ہو گیا تھا طالب حسین نے پہلی دفعہ اپنی توجہ ان دونوں کی طرف کی تھی۔

”پری گل نے عطاء اللہ سے کیوں شادی کی تھی؟“ جاین نے پوچھا۔

”رحیم بخش کے مرنے کے بعد عطاء اللہ نے اپنی رقم کا مطالبہ کر دیا تھا وہ بھی سود سمیت۔ اصل رقم تو وہ شاید ادا کر دیتی سود کہاں سے دیتی۔ پری گل کے پاس قرض ادا کرنے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ عطاء اللہ سردار کے پاس فیصلہ لے گیا، سردار نے پری گل سے پوچھا وہ کب تک عطاء اللہ کا قرض واپس کرے گی۔ اُس نے کہا میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ صرف میرے باپ کا گھر ہے۔ اگر میں اُسے بیچ دیتی ہوں تو میں کہاں جاؤں گی۔ سردار نے عطاء اللہ سے پوچھا اب بتاؤ کیا کہتے ہو۔ عطاء اللہ بولا: یہ اپنے باپ کے گھر ہی میں رہے۔ میں قرض اور سود چھوڑتا ہوں اس کے بدلے میں پری گل کو مجھ سے نکاح کرنا ہوگا۔ پری گل نے

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

یہ سنا تو اس کے آنسو نکل آئے پھر بھی اس نے ہاں کر دی تھی۔“ ساجد کی آنکھوں میں نمی تھی۔

جائین پتھرائی ہوئی آنکھوں سے خیالوں میں گم تھا۔ طالب حسین حساب بھول گیا تھا یہ باتیں سن کر۔ جائین کو پہلے اٹھارہ ہزار کا غم تھا۔ پری گل کی کہانی جاننے کے بعد اُسے نئی پریشانی نے گھیر لیا تھا۔ وہ رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ ایک پری، جن کی قید میں ہے اور کسی آدم زاد کا انتظار کر رہی ہے۔ جائین نے رات کھلی آنکھوں سے گزار دی تھی۔ اگر وہ آنکھیں بند کرتا تھا تو پری گل کا حسین چہرہ بند آنکھوں کے اندھیرے کے آگے آ جاتا تھا۔

اگلا دن فیصلے کا دن تھا۔ سردار نے ساجد اور طالب حسین کو باہر بیٹھنے کا حکم دیا تھا۔ جب وہ لوگ بیٹھک سے باہر چلے گئے تھے تب سردار نے پری گل کو زنان خانے سے بلوایا تھا۔ اُس وقت وہاں صرف چار افراد تھے۔ سردار، عطاء اللہ، پری گل اور جائین۔ سردار نے پری گل کی طرف دیکھا جو کہ پردے میں تھی۔

”گل بیٹی...! تم بتاؤ ساری بات۔“

پری گل نے ساری بات بوڑھے سردار کو بتائی:

”سارا قصور میرا ہے۔ اس لڑکے نے تو ہماری مدد کی تھی۔“ پری گل نے آنکھ بھر کر جائین کو دیکھا تھا۔

پری گل کی آنکھوں میں کچھ تو تھا۔ عطاء اللہ تو وہ نہ دیکھ سکا مگر تجربے کی آنکھ سے کچھ نہ چھپ سکا۔ سردار کی نظریں پری گل پر مرکوز تھیں۔ جائین نے بھی چپکے سے پری گل کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

”سردار...! میری بیوی کو بھی سزا ملنی چاہیے۔ یہ میری غیر موجودگی میں گھر سے باڑے میں آئی اور اس لڑکے کا ہاتھ تھاما اور پتہ نہیں کیا کچھ کیا ان دونوں نے... میں پھر بھی اسے رکھے ہوئے ہوں۔“ عطاء اللہ اپنی عظمت بیان کر رہا تھا۔

سردار نے پری گل کو واپس زنان خانے میں جانے کا حکم دیا، پری گل نے جاتے ہوئے نفرت سے عطاء اللہ کو دیکھا تھا۔

”ٹھیکے دار...! تم عطاء اللہ کو اٹھارہ ہزار روپے دے دو۔“

طالب حسین نے جلدی سے اٹھارہ ہزار روپے عطاء اللہ کو پیش کر دیے تھے جو کچھ دیر پہلے پری گل کے جانے کے بعد ساجد کے ساتھ اندر آیا تھا۔ عطاء اللہ نے جلدی سے رقم گن کر کھیسے میں ڈال لی تھی۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
جائین گردن جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ اسے اٹھارہ ہزار جانے کا افسوس نہیں تھا۔ ہاں عطاء اللہ کی باتوں سے ضرور
دکھ پہنچا تھا۔

”عطاء اللہ...! تمہاری رقم پوری ہے؟“ سردار نے پوچھا۔ عطاء اللہ نے خوشی سے گردن کو ہلایا۔
”عطاء اللہ...! چھ ہزار گوشت والے اور اٹھارہ ہزار یہ، کل چوبیس۔ اس میں چھبیس ہزار اور ڈالو اور
ابھی کے ابھی پری گل کو طلاق دے کر فارغ کرو۔ وہ اسی لائق ہے جو اپنے خاوند کی غیر موجودگی میں اس کا
بچھڑا ذبح کروادے، اس کی اجازت کے بغیر گھر سے باڑے تک آئے اور کسی غیر مرد کا ہاتھ تھام لے اسے
یہی سزا ملنی چاہیے۔ تم پچاس ہزار حق مہر ادا کرو اور پری گل کو ابھی طلاق دو۔“
”مگر سردار...!“ عطاء اللہ نے پریشانی سے کہا تھا۔

”اگر مگر چھوڑو... یہ میرا فیصلہ ہے اور تم تو میرے فیصلوں سے اچھی طرح واقف ہو۔“ بوڑھے سردار
نے رُعب دار آواز میں فرمان جاری کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ عطاء اللہ طلاق دیتا وہ زمین پر گر گیا منہ کے
بل۔ تھوڑی دیر بڑپا پھر اس کے جسم کو سکون مل گیا تھا۔ ادھر روح کو جسم کی قید سے آزادی ملی دوسری طرف پری
بھی آزاد ہو گئی ایک جن کی قید سے۔ پانچ ماہ بعد بوڑھے بلوچ سردار نے پری گل کا نکاح جمال امین سے کروا
دیا تھا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے جمال امین کون؟ اپنا جائین...!

☆.....☆.....☆

تقریباً پونے گیارہ بجے

”جہاں خیر نہیں ہوتا وہاں شر ہوتا ہے اور جہاں لنگر نہ ہو وہاں بھوک ہوتی ہے۔ آپ اگر لنگر کو ختم کرو گے تو بھوک دنیا کا سب سے بڑا مذہب بن جائے گی، بھوک ہاتھی کو بندر بنا دیتی ہے اور انسان کو حیوان۔ اللہ کی شان دیکھیں چوہان صاحب...! فقیر کے در سے لنگر ملتا ہے اور وقت کے حکمرانوں کے در سے دھکے۔“

”کیا یہ وہی لنگر ہے جو صوفیا کی خانقاہوں پر ملتا تھا؟“ میں نے پانی کی طرح پتلی دال اور بڑکی طرح سخت روٹی کی طرف دیکھ کر پوچھا تھا۔ میاں لطفی کے چہرے پر میٹھی مسکراہٹ اُبھری۔

”چوہان صاحب...! آپ اسے لنگر مت کہیں کوئی دوسرا نام دے دیں۔ آپ نے کبھی بغیر جانے، بغیر پوچھے دس لوگوں کو کھانا کھلایا ہے؟“

میں نے نفی میں گردن ہلا دی تھی۔

”یہاں پر لاکھوں لوگ روزانہ کھاتے ہیں۔ کوئی کھلانے والا کسی کا نام نہیں پوچھتا... معاف کیجیے گا...! آپ جیسے لوگ گھرانہ دیکھ کر کھانا بھجواتے ہیں۔“ میاں لطفی نے سانس لی تو میں فوراً بول پڑا:

”کیا؟ آپ اپنے گھر میں اسی طرح کا کھانا اپنے بچوں کو کھلاتے ہیں؟“

”چوہان صاحب...! آپ کو بھی یورپ والوں کی طرح اسلام کی خوبیاں نظر نہیں آرہی ہیں۔ دنیا کے کسی حصے میں لنگر جیسا کوئی سسٹم ہو تو بتائیں یورپ، امریکا کی کوئی حکومت روزانہ چوبیس گھنٹے لاکھوں لوگوں

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
 کو مفت کھانا کھلاتی ہو۔ کوئی ادارہ این جی او وغیرہ۔ آپ کو ایک بھی ایسا صاحب حیثیت آدمی نہیں ملے گا۔ لنگر
 خدائی دسترخوان ہے جو اولیاء اللہ کی درگاہوں پر ہی بچھتا ہے۔ اولیاء اللہ ہی اسلام کے صحیح نمائندے ہیں۔
 آپ اور وہ یورپ والے چند خارجی ذہنوں کو اسلام کے نمائندے بنا کر پیش کرتے ہیں۔“
 ”میاں صاحب...! میں لنگر کی کوالٹی کی بات کر رہا تھا۔ آپ نے مجھے بھی یورپ والوں کے ساتھ ملا
 دیا ہے۔“

”کسی بھی چیز کی کوالٹی کو بہتر بنانے کے لیے وقت اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ محنت کرنے کے
 لیے وقت ہمارے پاس نہیں ہے۔ بڑے کھاتے پیتے حضرات باہر ہی سے لنگر کے لیے پیسے دے کر چلے
 جاتے ہیں۔ اُن کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا کہ وہ دیکھ لیں جو رقم انھوں نے لنگر کے لیے دی ہے کھانا اُسی
 معیار کا ہے۔ پہلے لوگ اپنے گھروں سے کھانا لا کر درگاہوں پر تقسیم کرتے تھے۔ وہ اسپیشل کھانا ہوتا تھا۔ ایسا
 کھانا لوگ اپنے گھروں میں بھی نہیں کھاتے تھے جیسا وہ لوگ درگاہوں، مزاروں پر تقسیم کرتے تھے۔ اب بھی
 کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں مگر ایسا کرنے والوں کی تعداد کم ہو گئی ہے۔ آپ کی نظر جس پتلی دال اور روٹی پر لگی
 ہوئی ہے وہ تو اپنا روزگار کما رہا ہے۔ یہاں سو کے قریب لنگر خانے قائم ہیں جو یہ کاروبار سالوں سے کر رہے
 ہیں، یہ لوگ اللہ کی مخلوق کو کچھ نہ کچھ کھلا کر ہی کماتے ہیں۔ ہمارے پاکستان میں تو لوگوں کے منہ سے نوالہ
 چھین کر کمانے کا فیشن چل پڑا ہے۔“

اچانک میاں لطفی کے موبائل پر نعتیہ کلام لگ گیا کسی نے کال کی تھی۔ میاں لطفی بات کرنے میں
 مصروف ہو گئے۔

”لنگر والے... لنگر والے... آ جاؤ... لنگر والے۔“ آواز بلند ہوئی تھی۔ میری نظروں نے آواز کا پیچھا
 کیا تھا، میں کیا دیکھتا ہوں، لُنج کے ڈسپوزیبل بوکس ایک عورت تقسیم کر رہی تھی۔ میں نے ایک نظر میاں لطفی پر
 ڈالی۔ وہ بات کرتے ہوئے میری طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے مجھے اشارہ کیا ایک بوکس لینے کے
 لیے۔ میری انا کا بت لنگر لینے کے لیے تیار نہیں تھا پھر بھی میں چند قدم آگے بڑھ گیا۔ چالیس پچاس لوگ وہ
 بوکس لے کر دائیں بائیں کھڑے بیٹھے کھانے میں مصروف تھے۔ اُس عمر رسیدہ خاتون نے شاید میری آنکھوں
 کی تحریر پڑھ لی تھی۔ اُس نے ایک مزدور کے ہاتھ ایک لُنج بوکس مجھے بھی بھیجا تھا۔ میں نے وہ بوکس تھام لیا۔
 ”چوہان صاحب...! بھولے کی دکان پر بیٹھ کر کھائیں۔ مجھے تھوڑا کام ہے۔ ان شاء اللہ دوبارہ

زندگی کے بعد... موت سے پہلے ملاقات ہوگی۔“ میاں لطفی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ وہ مجھے بھولے کے حوالے کر گئے تھے۔ میں لکڑی کے ایک بیچ پر بیٹھ گیا تھا اور میں نے وہ لٹچ بکس کھولا۔ قیمے والے چاول تھے اوپر دو شامی کباب۔ ساتھ تھوڑا سا حلوہ۔ میں ان دنوں وزن کم کرنے کے چکر میں ڈانٹنگ کر رہا تھا، چاول اور میٹھا دونوں ہی میرے پرہیز میں شامل تھے۔ میں نے کھانے کی کوالٹی چیک کرنے کی غرض سے ایک نوالہ منہ میں ڈالا۔ ڈانٹنگ گئی بھاڑ میں۔ ایسے ٹیسٹی قیمے والے چاول میں نے پوری زندگی میں نہیں کھائے تھے۔ چاول کھانے کے دوران میں نے بھولے کو رسماً صلح ماری تھی۔ بھولا بولا:

”باؤ جی...! آپ کھاؤ، میں بچپن سے کھا رہا ہوں۔“

میں نے پورا بکس ختم کر کے ہی گردن اٹھائی تھی۔ جیسے ہی میں نے کھانا ختم کیا ایک لڑکا دو کپ اور تھرماس تھا مے ہوئے وارد ہوا تھا۔

”بھولے...! ابا جی نے مہمان اور تمہارے لیے چائے بھیجی ہے۔“ اُس لڑکے نے تھرماس اور کپ رکھتے ہوئے کہا۔

بھولا دو عورتوں کو پھول اور مخانوں کا پیکٹ دے رہا تھا۔ بھولے نے مجھے چائے ڈال کر پیش کی۔ میں نے پہلا گھونٹ لیا۔

”واہ...!“ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ویسی چائے بھی میں نے کم ہی پی تھی۔ بھولے نے مجھے بتایا:

”میاں لطفی کے شوق بھی نرالے ہیں۔ یہاں پر آنے والے زائرین کی خدمت کرتے ہیں۔ لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں خود اپنے ہاتھوں سے۔ چائے اور پان کے شوقین ہیں۔ نماز کے وقت اُن کے منہ میں پان نہیں ہوتا یا پھر چائے پینے کے دوران۔

لنگر کے متعلق بتانے والا تو وہاں نہیں تھا۔ مجھے دو طرح کا کھانا کھا کر لنگر کی سمجھ آ گئی تھی۔ قیمے والے چاول کھانے سے پہلے میں نے پتلی دال اور ربڑ کی طرح سخت روٹی بھی کھائی تھی۔ سچ کہوں تو دال روٹی کا بھی اپنا ہی مزہ تھا۔ میں اپنی چائے ختم کر چکا تھا۔ بھولے نے مجھے کہا:

”باؤ جی...! آپ بیٹھو، میں نماز پڑھ کر آیا۔“ وہ یہ بول کر وہاں سے چلا گیا، اُس نے مجھے نماز کی دعوت نہیں دی، میں بھی ہفتہ وار نمازی تھا۔ اس میں بھی اللہ جھوٹ نہ بلوائے، ڈنڈی مار لیتا، بھولا بھی اولیاء

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

اللہ کے طریقے پر تھا۔ اُس نے بھی تلقین کی بجائے عمل کا رستہ چنا۔

بھولا نماز پڑھ کر آیا تو میں بھی اس کی دکان اُس کے حوالے کر کے نماز پڑھنے چلا گیا، عصر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں بھولے کے پاس آیا تو وہاں پر گاہکوں کا رش لگا ہوا تھا۔ جمعرات کا دن تھا۔ کوئی پھول خرید رہا تھا، کوئی مٹانے تو کوئی اگر بتی۔ بھولا اپنی دکان داری بھی کر رہا تھا اور مجھ سے باتیں بھی۔ بھولے کی اپنی کہانی بھی بڑی دل چسپ تھی اس نے مجھے بتایا:

”باؤ جی...! میں نے ہوش سنبھالا تو داتا کی نگری میں تھا۔ ان ہی گلیوں میں میرا بچپن گزرا ہے۔“
بھولے نے روشن آنکھوں سے گلی کی طرف اشارہ کیا تھا فخریہ انداز میں۔

”باؤ جی...! آپ میاں صاحب سے لنگر کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ میں نے ساری زندگی یہی لنگر کھایا ہے اور اسی کے سہارے زندگی کو بچایا ہے۔ مجھے نہیں پتا میں کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں، میرے ماں باپ کون ہیں، بھوک لگتی تو لنگر کھا لیتا۔ اُداس ہوتا تو حضور داتا صاحب کے سامنے جا کر بیٹھ جاتا پھر ایک دن میاں لطفی صاحب کی نظر مجھ پر پڑی۔ انھوں نے مجھے نئے کپڑے لا کر دیے۔ تھوڑا بڑا ہوا تو مجھے پھولوں کا کام شروع کرنے کے لیے روپے بھی دیے۔ پھر میری شادی بھی کروائی۔ اب میرے دو بیٹے ہیں، عاطف اور ثاقب۔ اپنا چھوٹا سا گھر بھی ہے۔ اللہ نے بڑا کچھ دیا ہے حضور داتا صاحب کے صدقے۔“
”بھولے...! تمہیں نہیں لگتا داتا کہنا غلط ہے؟“ میں نے جھجکتے جھجکتے پوچھ ہی لیا تھا۔ بھولا مسکرایا اور کہنے لگا:

”باؤ جی...! آپ پڑھے لکھے لوگ بھی بھولے ہی ہوتے ہیں۔ میں پڑھا لکھا تو نہیں ہوں پھر بھی اتنا تو مجھے بھی پتا ہے ”داتا“ دینے والے کو کہتے ہیں۔ ہر دینے والا خدا نہیں ہوتا۔ ہاں...! سب کچھ دینے والے کو اللہ کہتے ہیں۔ ابھی وہ عورت لوگوں کو کھانا دے کر گئی ہے تو کیا وہ داتا نہیں؟ ابھی آپ نماز پڑھ کر آئے ہیں، آپ نے دیکھا ہوگا داتا صاحب کے روضے کی طرف کوئی کنڈ (پشت) نہیں کرتا۔ ہم مغرب کی نماز پڑھنے چلیں گے جب جماعت کھڑی ہوگی تو ہزاروں لوگوں کی کنڈ حضور داتا صاحب کی طرف ہو جائے گی۔ سیدھی بات ہے باؤ جی...! جب داتا کے ساتھ صاحب لگ جائے تو کاہے کا داتا۔ مجھے سمجھ نہیں آتی ہم لوگوں نے اولیاء اللہ کو بھی نہیں بخشا اپنی دکان داری چلانے کے لیے کچھ ان کا نام بیچتے ہیں اور کچھ اولیاء اللہ کے اوپر اپنی تنقید کو بیچتے ہیں۔ باؤ جی...! نماز ادب سکھاتی ہے۔ ہم نماز پڑھنے کے دوران کسی داتا صاحب کا ادب

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

نہیں کرتے صرف اور صرف اپنے اور حضور داتا صاحب کے اللہ کو سجدہ کرتے ہیں۔“

میں بھولے سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر اس کا جذباتی انداز دیکھ کر خاموش ہو گیا تھا۔ میں کسی فرقے کا پرچار نہیں کر رہا۔ جو کچھ بھولے سے سنا ایمان داری سے لکھ دیا۔ ہاں...! ایک بات بھولے نے کمال کی، کی تھی۔ نماز کے دوران کوئی بھی شخص یہ نہیں سوچتا کہ اس کی پشت عظیم صوفی بزرگ ابوالحسن علی بن عثمان الجبیری رحمۃ اللہ علیہ المعروف داتا صاحب کی طرف ہو رہی ہے۔ شاید یہی توحید ہے۔ اللہ کے سامنے کوئی داتا نہیں۔ کوئی صاحب نہیں۔ سب کے سب فقیر، منگتے، سوالی، محتاج، عاجز، بے بس اس کے بندے ہیں۔

اُس دن یکم جولائی بروز جمعرات 2010ء تھا۔ میں نے اور بھولے نے مغرب کی نماز اکٹھے ادا کی۔ اُس کے بعد میں شاد باغ لوٹ گیا کیوں کہ مجھے ایئر پورٹ پہنچنا تھا دہلی جانے کے لیے۔ رات ساڑھے بارہ بجے میری دہلی کی فلائیٹ تھی۔

داتا صاحب سے جاتے ہوئے رکشا میں سوار ہونے سے پہلے میں نے مڑ کر دیکھا تو میری نظر خواجہ معین الدین چشتیؒ کے شعر پر جا کر ٹھہری...

گنج بخش فیضِ عالم مظہر نورِ خدا

ناقصاں را پیر کامل کمالاں را رہنما

بورڈنگ کے بعد میں ویٹنگ ہال میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک مشہور ٹی وی چینل یہ خبر دے رہا تھا: ”یہ آپ دیکھ سکتے ہیں پہلے ایک حملہ آور جس کا میٹل ڈیٹیکٹ ہوا سیکورٹی اہلکار اور رضا کار نے اسے پکڑنا چاہا تو وہ اندر کی طرف بھاگا۔ اس سے پہلے وہ اسے پکڑتے حملہ آور نے وضو خانے میں پہنچ کر خود کو دھماکے سے اڑا لیا۔ یہ دھماکا 10 بج کر 48 منٹ پر ہوا تھا۔ جب لوگ اس دھماکے کے بعد باہر بھاگ رہے تھے تو اسی گیٹ سے ایک اور خود کش حملہ آور اندر داخل ہوا جس کے ہاتھ میں بیگ تھا۔ اس نے دربار کے احاطے میں پہنچ کر ٹھیک 10 بج کر 53 منٹ پر دوسرا دھماکا کر دیا۔ ان دھماکوں میں چالیس افراد شہید اور ایک سو پچھتر زخمی ہوئے۔“

”داتا صاحب کے دربار پر دھماکے؟“ میں نے خود سے پوچھا تھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے اس ملک میں؟“

!!I am deeply shocked too!!

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

!!It is sad to know!!

!!How sad!!

”یا اللہ...! اس ملک کو دشمنوں سے محفوظ رکھ۔“

”یہ ملک رہنے کے قابل ہی نہیں رہا۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ... جس ملک میں مسجدیں، درگاہیں، امام بارگاہیں ہی محفوظ نہ ہوں اُس

ملک کا اللہ ہی حافظ ہے۔“

LCD کے ارد گرد جمع لوگ افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔ جہاز میں سارے رستے عجیب سی طبیعت رہی۔ دہی پہنچا گلے دن دیر تک سوتا رہا پھر وہی دنیا کے دھندے جھیلے۔ سچی بات ہے کبھی اُن دھماکوں کا خیال ہی نہیں آیا۔ چند ہفتوں بعد لنگر کے نام سے ایک افسانہ لکھنا شروع کیا تھا۔ وہ مکمل نہ ہو سکا پھر سوچا اس کا نام بھولا پھول والا رکھ دوں۔ نام بدل کر بھی کہانی مکمل نہ کر سکا تھا۔ وہ ادھوری کہانی کاغذ کے پنوں کے قبرستان میں کہیں دفن ہو گئی تھی۔

(آج پانچ سال چار مہینے اور چار دن بعد یعنی پانچ نومبر بروز جمعرات 2015ء کو لنگر اور بھولا پھول والا میرے سامنے کاغذ کے سینے پر درج ہیں۔ آج اتنے سالوں بعد میں رات نو بجے کے قریب داتا صاحب پہنچا ہوں۔ اتنے عرصے کے بعد بھی ان دھماکوں کے اثرات اب بھی باقی ہیں۔ پہلے کی نسبت سیکورٹی بہت زیادہ ہے۔ حفاظتی اقدامات کے پیش نظر بہت سارے بیرئیر اور جنگلے لگا دیے گئے ہیں)

میں نے سوچا پہلے سلام کر آتا ہوں اس کے بعد بھولے اور میاں لطفی سے ملوں گا۔ میں تلاش کر رہا تھا کسی عینی شاہد کو جو ان دھماکوں کے وقت وہاں موجود ہو۔ میں حضور داتا صاحب کی درگاہ پر سلام کر کے آگے بڑھا ہی تھا کہ ایک آواز نے میرے قدم روک لیے۔

ایک صاحب سفید شلوار قمیض میں ملبوس، گلے میں گلاب اور گیندے کے پھولوں کا ہار، بانیں ہاتھ میں بڑی سی تسبیح، ہونٹوں پر میٹھا سا تبسم، آنکھوں میں چمک اور آواز میں ٹھہراؤ داتا صاحب کے مزار کے ایک ستون کے ساتھ بڑے پرسکون انداز میں ٹیک لگائے ہوئے دو اسٹوڈنٹس کو پنجابی کے اشعار لکھوا رہے تھے۔ میں نے اجازت لی اور میں بھی ان کی مجلس میں بیٹھ گیا، وہ صاحب کافی دیر ان لڑکوں سے بات کرتے رہے۔ اس کے بعد میری باری آئی، میں نے اپنا تعارف کروایا، ان صاحب نے مجھے بتایا اس دن وہ اسی جگہ بیٹھے

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

ہوئے تھے جب دھماکے ہوئے تھے۔ ان کے بقول شہید ہونے والوں کی تعداد سرکاری اعداد و شمار کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی اور زخمیوں کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں تھی۔

وہ صاحب مشہور فلم ساز محمد سرور بھٹی تھے جنہوں نے مولا جٹ فلم بنائی تھی۔ انہوں نے کہا:

”مولا تو مولا ہی ہے۔ ایک انسان مولا جٹ تو ہو سکتا ہے، مگر ایک جٹ کبھی بھی مولا نہیں بن سکتا۔ نوری نت ”نہیں“ کی لت میں مبتلا تھا، مولا جٹ ماننے والوں کی جگہ پر کھڑا تھا، جو اپنے مولا کی مان لیتا ہے وہ اُسے مولا جٹ بنا دیتا ہے۔ مولا کی نامانے والے نور ہوتے ہوئے بھی بے نور ہو جاتے ہیں جیسے نوری نت۔ چوہان صاحب...! مولا جٹ اچھائی کا نام ہے اور نوری نت بُرائی کی علامت۔“

محمد سرور بھٹی کی بات سن کر میرا دل چاہا بھولے سے دوبارہ ملوں۔ میں نے بھٹی صاحب سے اجازت لی اور درگاہ سے نکل آیا۔ تھوڑی دیر بعد میں مزار کے دائیں طرف والے بازار میں تھا اور بھولے کی دکان تلاش کر رہا تھا۔ تھوڑی مشقت کے بعد مجھے بھولے کی دکان مل گئی۔

بھولے کی بجائے ایک تیرہ چودہ سال کا لڑکا دکان پر بیٹھا تھا۔ میں نے سوچا اس کا بیٹا ہوگا۔
”لنگر والے... لنگر والے...“

دونو جوان لڑکے تھے۔ انہوں نے ایک بڑا سا تھیلا پکڑا ہوا تھا جس میں سے وہ شاپر بیگ نکال نکال کر تقسیم کر رہے تھے۔ میں نے بھی بڑھ کر ایک شاپر بیگ پکڑ لیا، اس کے اندر چکن بریانی تھی۔ میں نے اپنا شوڈر بیگ ایک طرف رکھا اور کھڑے ہو کر بائیں ہاتھ میں تھیلی کے اوپر شاپر بیگ رکھا اور دائیں ہاتھ سے کھانا شروع کر دیا، میں بریانی کھانے میں مصروف تھا کہ ایک ہاتھ میرے کندھے پر آیا۔

”چوہان صاحب...! لنگر کھا رہے ہیں۔“

میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ میاں لطفی منہ میں پان ڈالے ہوئے بول رہے تھے۔

”آپ نے مجھے پہچان لیا اتنے سالوں بعد بھی؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”چوہان صاحب...! کون سی صدیوں کی بات ہے۔ پانچ سال چار ماہ اور چار دن ہی ہوئے ہیں۔“

”آپ یہاں اس وقت؟“ میں نے عجیب سا سوال پوچھ لیا تھا۔ میاں لطفی مسکرائے اور بولے:

”چوہان صاحب...! دوسری گلی میں میرا گھر ہے۔ ہم نے کہاں جانا ہے۔ (جینا یہاں، مرنا یہاں،

اس کے سوا جانا کہاں)“

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

میاں لطفی نے مکیش کا گانا گنگنا یا۔ اس کے بعد وہ مجھے بڑی محبت سے اپنے گھر لے گئے۔ انھوں نے مجھے اپنی بیٹھک میں بٹھایا اور خود اندر چلے گئے۔ بیٹھک کی ایک دیوار کے ساتھ کتابوں کی ایک لائبریری تھی جس میں صحاح ستہ کی ساری حدیثیں اور بہت سارے اولیاء کرام کی تصانیف موجود تھیں۔ دوسری دیوار کے اوپر بیت اللہ اور گنبد خضریٰ کے نیچے بہت سارے اولیاء کرام کے مزارات کی تصویریں فریموں میں بھی ہوئی آویزاں تھیں۔ بیٹھک سے بھینی بھینی خوش بو آرہی تھی۔ گھر تو پرانے عہد کا تھا۔ پھر بھی اچھی طرح سے رکھا گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میاں لطفی ٹرے میں دو کپ چائے لے کر بیٹھک میں داخل ہوئے:

”چوہان صاحب...! یہ لیں چائے۔ میں نے خود بنائی ہے اپنے ہاتھوں سے۔“

اس وقت میاں لطفی کے منہ میں پان نہیں تھا۔ وہ کلی کر کے آئے تھے۔ مجھے بھولا یاد آ گیا اس نے کہا

تھا:

”نماز کے وقت ان کے منہ میں پان نہیں ہوتا یا پھر چائے پینے کے دوران۔“

میں نے چائے کا گھونٹ لیا۔ وہی ذائقہ، وہی خوش بوجو پانچ سال پہلے تھی۔

”آج بھولا نظر نہیں آیا بازار میں؟“ میں نے چائے پینے کے دوران پوچھا۔ میاں لطفی نے میری

طرف دیکھا پھر سنجیدگی سے کہنے لگے:

”آپ چائے ختم کر لیں پھر بتاتا ہوں۔“

میں نے چائے ختم کی اور پرچ کپ میز پر رکھا اور میاں لطفی کی طرف متوجہ ہوا۔ میاں لطفی کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ پرچ اور کپ ان کے ہاتھ میں تھا۔ میں گرم گرم چائے پینے کا عادی ہوں۔ میں نے سوچا شاید میں نے جلدی چائے ختم کر لی ہے۔ میں کافی دیر میاں لطفی کو دیکھتا رہا انھوں نے چائے کا ایک بھی گھونٹ نہیں لیا، مجھے کچھ تشویش سی ہوئی تھی۔

”میاں صاحب...! میاں صاحب...!“

”جی... جی...“ انھوں نے بوکھلاہٹ میں جواب دیا۔

”کہاں کھو گئے ہیں آپ؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں کچھ نہیں۔“ انھوں نے پرچ اور کپ میز پر رکھا اور خود واش روم میں چلے گئے۔ میں نے

دیکھا کپ چائے سے آدھا بھرا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میاں لطفی واپس آئے تو انھوں نے تولیے سے منہ صاف

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

کیا اور اسے کرسی کی پشت پر ڈال دیا تھا اور بیٹھتے ہوئے بولے:

”چوہان صاحب...! میں آپ کا چہرہ ساری عمر نہیں بھول سکتا تھا۔ جس دن آپ لنگر کے بارے میں پوچھ رہے تھے اسی رات وضو خانے سے پہلے لنگر خانے میں دھماکا ہوا تھا۔ اس کے بعد اوپر حضور داتا صاحب کے روضے اور مسجد کی سیڑھیوں کے درمیان دوسرا دھماکا ہوا تھا۔ مجھے دھماکوں کے دوسرے دن خیال آیا شاید آپ بھی ان لوگوں کی پلاننگ میں شامل تھے۔ میرا دماغ مجھے یہ کہہ رہا تھا مگر دل نہیں مانتا تھا۔ پہلے بھی میں بازار میں ہی گھومتا رہتا تھا۔ اب صرف نماز کے اوقات میں رکتا ہوں۔ نہیں تو گشت کرتے رہتا ہوں دربار کے چاروں اطراف۔ آج آپ جب درگاہ میں جانے کے لیے لائن میں لگے تھے تو پولیس والے نے آپ سے کہا تھا:

”آپ یہ بیگ اندر نہیں لے جاسکتے ہیں۔“

آپ نے جواب دیا: ”اس میں کتابیں اور کچھ کاغذات ہیں۔“

پولیس والا بولا: ”جو بھی ہے یہ اندر نہیں جاسکتا۔ آپ بیگ کو اس دکان پر جمع کروادیں۔“

آپ مسکراتے ہوئے فوراً مان گئے پھر آپ نے وہ بیگ رشید کی دکان پر جمع کروادیا، میں نے ایک لڑکے کی ڈیوٹی لگائی کہ اس بیگ کی اچھی طرح سے تلاشی لے۔ میں آپ کے پیچھے ہی تھا۔ آپ کو خبر نہیں ہوئی پھر آپ نے آنکھیں بند کر کے حضور کو سلام پیش کیا۔ اس کے بعد دعا کی۔ پھر آپ نے ارد گرد کا جائزہ لیا اور محمد سرور بھٹی کے پاس بیٹھ گئے۔ آپ بھٹی صاحب سے اُن دھماکوں کے متعلق پوچھنا شروع ہو گئے۔ میں نے دوسرے آدمی کی ڈیوٹی لگائی کہ آپ پر نظر رکھے۔ خود واپس رشید کی دکان پر گیا جہاں آپ نے اپنا یہ والا بیگ رکھا تھا۔ میں خود اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے اندر بہت سارے کاغذات تھے۔ ایک دو ڈائریاں تھیں اور ایک ناول بلال صاحب بھی تھا۔

میں نے اسے کھولا صفحہ نمبر 51 کھل گیا۔ میں نے پڑھا ایک لائن مجھے بہت اچھی لگی تھی۔

”اقبال سے بہت بلند اقبال کا اقبال ہے اور اقبال سے بھی بلند بلال کا اقبال ہے۔“

پھر میں نے چند صفحے اور پلٹے تو صفحہ نمبر 102 پر لکھا ہوا تھا:

”بلال کا مطلب ہے عشق..... عشق کا مطلب ہے بلال۔“

چوہان صاحب...! سچ کہوں تو آپ کو آپ کے ناول بلال صاحب نے بچا لیا نہیں تو میں پولیس کو

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

فون کرنے لگا تھا۔“

میاں لطفی کی بات سن کر میرے طوطے اڑ گئے تھے۔

”میں آپ کو سمجھ نہیں پایا آپ کون ہیں؟ اور کیا کرتے ہیں کہیں آپ کسی سیکرٹ ایجنسی...“

”نہیں... نہیں... میرے بزرگ صدیوں سے یہاں آباد تھے۔ درگاہ کے ساتھ والے بازار کی بیشتر

دکانیں میری ہیں۔ میرے بچے شہر کے پوش علاقوں میں شفٹ ہو گئے۔ بیوی فوت ہو چکی ہے۔ میں یہاں

اکیلا رہتا ہوں۔“ میاں لطفی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔ پھر کافی دیر خاموش رہے دوبارہ بولے:

”چوہان صاحب...! میں نے دھماکوں سے پہلے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ لوگ یہاں بھی دھماکے

کر سکتے ہیں۔ اس حادثے کے بعد سے سکیورٹی بڑھ گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اور میرے چند ساتھی

دربار کے ارد گرد گھومتے رہتے ہیں اور ہماری ہر آنے جانے والے پر نظر ہوتی ہے۔“

میاں لطفی کی آنکھوں میں پہلی بار میں نے نمی دیکھی تھی۔ انھوں نے پان بکس سے ایک پان نکالا

اور منہ میں ڈال لیا۔ اپنے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کو سر کے بالوں سے صاف کیا۔

”میاں صاحب...! میں اجازت چاہوں گا۔“ میں نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

”بھولا کہاں ملے گا؟“

میاں لطفی نے گھڑی پر وقت دیکھا۔ پونے گیارہ بجنے والے تھے۔

”آپ آئیں میرے ساتھ!“

میں میاں لطفی کے پیچھے چل دیا۔ بازار سے گزرتے ہوئے میں نے بہت سارے غریبوں کو کھانا

کھاتے دیکھا تھا۔ میرا ایک دوست کہتا ہے:

”درگاہوں کے ارد گرد جرائم پلتا ہے۔“

جرائم پلتا ہوا تو میں نے نہیں دیکھا تھا۔ ابھی تو میں دربار کے گرد و نواح میں غریبوں کو پلتے ہوئے

دیکھ رہا تھا۔ میں میاں لطفی کے پیچھے چلتا ہوا دربار اور مسجد کے درمیان واقع صحن میں پہنچ گیا، وہاں دُعا ہو رہی

تھی۔ آہیں اور سسکیاں بلند تھیں۔ آنسو نکل رہے تھے۔ داتا صاحب کے ماننے والے عقیدت مند رو رو کر

اپنے اور داتا صاحب کے اللہ سے مانگ رہے تھے۔

دعا ختم ہوئی تو لنگر تقسیم ہونا شروع ہو گیا، کہیں قیمے والے نان، کہیں مٹھائی، کہیں ٹافیاں۔ بے شمار

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

چیزیں کھانے کو اور دیکھنے کو ملی تھیں۔ لنگر کے متعلق تو مجھے سارے جواب مل گئے تھے۔ جس طرح ہم لوگ اپنے اپنے گھروں میں کبھی چٹنی سے روٹی کھا لیتے ہیں اور کبھی گھی شکر سے کبھی لسی کی کڑھی سے کام چلایا جاتا ہے اور کبھی بکرے کا گوشت ہمارے دسترخوان پر ہوتا ہے۔

لوگوں کا رش کافی حد تک کم ہو چکا تھا۔ مجھے بھولا کہیں نظر نہیں آیا۔ میں یہ سوچ رہا تھا وہ بھی دُعا میں ہوگا مگر نہیں... نظر نہیں آیا۔ اس سے پہلے کہ میں میاں لطفی سے بھولے کے متعلق پوچھتا۔ میاں لطفی ایک جگہ بیٹھتے ہوئے بولے:

”چوہان صاحب...! یکم جولائی آج ہی کے دن 2010ء کو دوسرا دھماکا وہاں ہوا تھا۔ تقریباً پونے گیارہ بجے۔ ٹھیک گیارہ بجے میں یہاں پہنچا تھا اور اس جگہ بھولے کا سر پڑا ہوا تھا۔“
میاں لطفی نے اس سفید ماربل پر ہاتھ پھیرا جہاں ان کے بقول بھولے پھول والے کا سر پڑا ہوا تھا۔ وہ گردن جھکائے ہوئے تھے اسی جگہ۔ ان کی آنکھوں سے آنسو گرنا شروع ہو گئے۔
”چوہان صاحب...! مجھے صرف بھولے کا سر ملا تھا، دھڑکا پتا نہیں۔ تقریباً پونے گیارہ بجے سینکڑوں دوسرے شہداء کے ساتھ ساتھ بھولے کو بھی شہادت نصیب ہوئی تھی۔“
تقریباً پونے گیارہ بجے۔“

☆.....☆.....☆

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی مجھے ایکسپلائٹ کرے۔“

سکندر سعید نے فریش جوس کا سیپ لیتے ہوئے حتمی انداز میں کہا تھا اپنے سامنے بیٹھی ہوئی رمشا دُرانی کو۔ رمشا کی آنکھوں میں چمک تھی۔ سکندر کو دیکھتے ہوئے وہ مسکرائی۔

”سکندر! تم نے کبھی سوچا ہے تم اب تک کتنی لڑکیوں سے فلرٹ کر چکے ہو۔ تم لڑکے اتنے تنگ نظر کیوں ہوتے ہو۔ تم کرو تو ٹھیک، دوسرا کرے تو کریکٹر ڈھیلا۔ لڑکیاں ہی ہمیشہ کمپرومائز کرتی ہیں، تم لڑکے کیوں نہیں۔ لڑکا براڈ مائنڈ ہو تو کوئی بات نہیں بچہ ہے۔ اگر لڑکی ہو تو بے حیا، بے شرم کریکٹر لیس۔ ایسا کیوں ہے؟“

”تمہاری انھی باتوں کی وجہ سے می میرے اور تمہارے رشتے کے خلاف تھیں۔“ سکندر نے موڈ دکھاتے ہوئے کہا تھا۔

”معاف کرنا مسٹر سکندر سعید! تمہارے گھر میں آنٹی کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ حد تو یہ ہے آنٹی تو انکل کو بھی خاطر میں نہیں لاتیں۔“

”تمہیں اپنا پراس یاد ہے نا؟ شادی سے پہلے تم جاب، بزنس یا پشمن، آئی ڈونٹ نو جو بھی ہے چھوڑ دو گی۔“ سکندر نے رمشا کے تیور دیکھ کر اُسے اُس کا وعدہ یاد کرایا تھا اُکتاہٹ کے ساتھ۔

”میں ایک نمبر کی ایڈیٹ ہوں جو تمہارا پراپوزل ایکسپٹ کر لیا۔ یونو سکندر! آنٹی نے میرے آفس

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
سے انوسٹی گیشن کی تھی میرے کریکٹر کے بارے میں۔ میرے لیے بہت بڑا چیلنج ہو گا تمہاری فیملی کے ساتھ
ایڈجسٹ کرنا۔“

”ڈونٹ ووری رمشا! آئی ہوپ مئی اور تمہارے بیچ انڈرا سٹینڈنگ ڈویلپ ہو جائے گی۔“ اس بار
سکندر نے رمشا کی پریشانی دیکھ کر تشفی دی۔

”سکندر! مجھے آنٹی اور اپنی انڈرا سٹینڈنگ کی فکر نہیں ہے اور نہ ہی یہ گلہ ہے کہ اُنھوں نے میرا
پروفائل دیکھ کر اس رشتے پر اپنی رضامندی ظاہر کی تھی۔ مجھے فکر صرف اس بات کی ہے...“ رمشات بات کرتے
کرتے رُک گئی۔ وہ نیلے سمندر کی طرف دیکھنے لگی جہاں پر لہریں سمندر کے اندر سے زور لگا کر آتیں اور جاتے
جاتے ساحل کی تھوڑی بہت ریت اپنے ساتھ بہا لے جاتیں۔ اُس نے گلاس کے پیندے میں بچا ہوا اپنا
فریش جوس ڈوبتے سورج کی طرف دیکھتے ہوئے ختم کیا۔

”تمہیں اُس پروڈکشن ہاؤس میں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا خود کا اسٹبلش برنس ہے۔
گاڑی ہے بنگلہ ہے اور کیا چاہیے تمہیں؟“ سکندر کی سوئی وہیں اُٹکی ہوئی تھی۔ رمشانے سنا تو اُس کے چہرے
پر اداس مسکراہٹ نے دستک دی۔

”سکندر! ٹیچنٹ اور ایگری منٹ میں فرق ہوتا ہے۔ خیر تمہارے نزدیک ان دونوں کی کوئی اہمیت
نہیں ہے۔ اٹیچمنٹ کرنے کے لیے پہلے ایگری منٹ نہیں کیا جاتا۔ سکندر میں پیسوں کے لیے کام نہیں کرتی۔
فلم میکنگ میرا پیشہ ہے۔“ رمشا یہ کہہ کر گاڑی کی طرف چل دی۔ وہ کلفٹن پر ڈوبتے سورج کو اکیلا چھوڑ گئی
تھی۔ سورج نے نہانے کے لیے پردہ کرنے کی بجائے اپنی لائٹیں ہی آف کر دی تھیں۔

”آج آفس سے چھٹی تھی میں اور سکندر لنچ کرنے کے بعد کلفٹن
چلے گئے۔ یہ سکندر میری فیلنگز کیوں نہیں سمجھتا۔ وہ بچپن ہی سے
مجھے ہرٹ کرتا آیا ہے۔ میں ہی ہوں جو اُس کے لیے مری جاتی
ہوں۔ اُس نے کبھی بھی میری کیئر نہیں کی۔ اب کہہ رہا ہے آفس
سے ریزائن کر دو۔“

اُسے پتا ہونا چاہیے میں نے اُس سے کی ہوئی ہر کٹمنٹ ہمیشہ
پوری کی ہے۔ اگر میں نے کہا ہے کہ میں کام چھوڑ دوں گی تو

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

اُسے میری بات پر ٹرسٹ کرنا چاہیے۔ ماما نے ہزار دفعہ مجھ سے کہا:

”رومی! سکندر ایک شکی مزاج لڑکا ہے۔ تم اُس سے شادی کر کے مشکل میں پڑ جاؤ گی۔“

سکندر ہر وقت مجھے ڈکٹیشن دیتا رہتا ہے۔ میں یہ کروں وہ نہ کروں، آخر کیوں؟“

”رمشا بی بی...! رمشا بی بی...!“ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ رمشا نے اپنی ڈائری بند کر کے اپنے تکیے کے نیچے رکھ دی اور اُٹھ کر دروازہ کھولا۔

”کیا ہے؟“ رمشا نے دروازہ کھولتے ہوئے بے زاری سے پوچھا۔

”وہ جی... نیگم صاحبہ نے آپ کو بلایا ہے۔ آپ کی شادی کے لیے اُنھوں نے بڑے اچھے اچھے سوٹ منگوائے ہیں۔“ ملازمہ نے چپکتے ہوئے خبر کے ساتھ ساتھ پیغام بھی دیا۔

”تم جاؤ... میں آتی ہوں۔“ رمشا نے اُسی بے زاری سے کہتے ہوئے فٹ سے دروازہ بند کر لیا۔

”ماما کو کون سمجھائے؟“ اُس نے خود سے کہا۔

”یہ دیکھو...! یہ لہنگا میں نے اسپیشل آرڈر پر تیار کروایا ہے۔“ رمشا کی ماں نے اُس کے لاؤج میں داخل ہوتے ہی کہہ دیا تھا۔

”مجھے نہیں پہننا یہ لہنگا وہنگا۔“ رمشا نے منہ بناتے ہوئے اپنے باپ کی بغل میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”رومی...! یہ بہت مہنگا ہے۔“ رمشا کی ماں کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ اُس کا باپ بول اُٹھا:

”مہنگا ہو یا سستا... رومی نے کہہ دیا نہیں پہننا تو مطلب نہیں پہننا۔“

”دُرانی صاحب...! آپ نے بگاڑا ہے اسے۔ لہنگا نہیں پہنوں گی تو کیا جینز پہنوں گی بارات والے

دن؟“

”آئیڈیا بُرا نہیں ہے۔“ رمشا کے باپ اطہر جلال دُرانی نے سنجیدگی سے کہا۔ رمشا نے اپنے باپ

کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے زور سے ہنسنا شروع کر دیا تھا۔ اُس کے باپ نے بھی اُس کا بھرپور ساتھ دیا۔

”دُرانی صاحب...! ہر بات کا مذاق مت بنایا کریں!“ رمشا کی ماں نے قدرے غصے سے کہا تھا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
 ”نہیب بیگم...! غصہ کیوں کر رہی ہو، چند دن کی مہمان ہے رومی اس گھر میں۔“ دُرانی صاحب نے
 نہیب کا بگڑا موڈ دیکھ کر کہا۔

”رومی بیٹا...! تم جاؤ، ریسٹ کرو۔“ رمشا کے جانے کے ساتھ ہی نہیب ایک بار پھر غصے سے بول
 پڑی:

”دُرانی صاحب...! ہمارے والدین نے بھی ہمیں لاڈلوں سے پالا تھا پر آپ جیسے چوچلے نہیں کیے
 تھے۔ جوان بچی ہے کیا ضرورت ہے اسے کام کرنے کی۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ ہمارا سب کچھ اسی کا ہے
 آج بھی اور کل بھی...“

”نہیب بیگم...! اُس نے کہا ہے کہ شادی سے پہلے وہ اپنا کام چھوڑ دے گی۔ تم بھی سکندر اور نائلہ
 بھابھی کی طرح اُس کے شوق کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ مجھے تو رمشا کی سمجھ نہیں آئی، میڈیا اور کمیونیکیشن میں ماسٹر
 کرنے کے بعد سکندر کے لیے سب کچھ چھوڑ رہی ہے۔“

”آپ کو پتا ہے نائلہ بھابھی بڑی مشکل خاتون ہیں۔ انھوں نے ساری زندگی آپ کے دوست کو
 اشاروں پر نچایا ہے۔ اب وہ شادی سے پہلے ہی رومی کو بھی اپنی جی حضوری پر لگانا چاہتی ہیں۔ سکندر، شازیہ
 اور آپ کے دوست سعید صاحب کی کیا مجال نائلہ بھابھی کی مرضی کے بغیر کچھ کر سکیں۔ دُرانی صاحب...! میں
 نے اسی لیے اس رشتے کی مخالفت کی تھی۔ آپ نے میری ایک نہیں سنی تھی۔“ نہیب نے سخت لہجے میں گلہ کیا
 تھا۔

”نہیب...! شادی تم نے کرنی ہے یا رومی نے؟ تم ہر دفعہ یہ قصہ لے کر بیٹھ جاتی ہو۔“ اطہر جلال
 دُرانی نے غصے کا جواب غصے سے ہی دیا تھا۔

”ہا... ہائے دُرانی صاحب...! بات کرتے ہوئے کچھ تو سوچ لیا کریں۔ اب میں اس عمر میں شادی
 کروں گی۔ ہمارا صوبہ الگ... زبان الگ... برادری الگ... یہاں تک کہ فرقہ بھی الگ... آپ نے کچھ نہیں
 دیکھا بس رشتہ طے کر لیا۔ بڑی آپا نے کتنی بار وقاص کے لیے رمشا کا رشتہ مانگا تھا۔“ نہیب نے بھی بھڑکتے
 ہوئے ہی کہہ دیا تھا۔

”تمہیں اعتراض اس بات پر ہے کہ وقاص کو کیوں انکار کیا یا دوسری باتوں پر؟“ دُرانی صاحب
 نے بھی اُسی کے لہجے میں سوال کیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے پر بھڑکے ہوئے تھے۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”کراچی منی پاکستان ہے۔ ہم ایک ملک میں رہتے ہوئے ایک نہ ہو سکے۔ پاکستان بننے سے پہلے دو قومی نظریے پر لڑائی تھی۔ اب ہم نے ایک قوم ہو کر ذاتوں، برادریوں، فرقوں پر لڑنا شروع کر دیا ہے۔“
دُرانی صاحب نے کہا اور غصے سے اُٹھ کر وہاں سے چلے گئے۔

”پاپا!... آپ دونوں ایک آئیڈیل کپل تھے، میری انجمنٹ کے بعد آپ دونوں میں اکثر جھگڑا ہوتا ہے۔“ رمشانے اپنے باپ کا ہاتھ تھامتے ہوئے نرمی سے کہا تھا۔

”رومی بیٹا!... ہماری زندگی بڑی پرسکون گزری ہے۔ تمہاری ماما سے ساری زندگی میرا کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ تمہاری ماما بہت لوگ اور کیئرنگ ہیں۔ وہ دیہاتی تھیں پڑھی لکھی بھی نہیں تھیں۔ تمہارے گرینڈ فادر نے رشتہ کر دیا تھا۔ مجھے اعتراض تھا پھر بھی ہماری شادی ہو گئی۔ اباجی کے فیصلے کے خلاف جانے کی مجھ میں جرات نہیں تھی۔ تمہاری پیدائش کے بعد ڈاکٹر نے مجھے بتایا:

”مسٹر دُرانی!... آپ کی وائف دوبارہ ماں نہیں بن سکتیں۔“

چند سال میں نے یہ بات تمہاری ماما سے چھپائے رکھی۔ جب اُنھیں پتا چلا تو بہت روئیں۔ اُنھیں بیٹے کی بڑی خواہش تھی۔ پھر ایک دن مجھے کہنے لگیں:

”دُرانی صاحب!... میں آپ کی دوسری شادی کروانا چاہتی ہوں۔“

میں نے ہنستے ہوئے پوچھا وہ کیوں؟ تو کہنے لگیں:

”مجھے بیٹا چاہیے۔“

پھر بولیں:

”میں نے آپ کے لیے گاؤں کی ایک لڑکی پسند کی ہے۔ وہ لڑکی بڑی اچھی ہے۔ بڑی خدمت کرے گی ہم دونوں کی...“

”ماما آپ کی سیکنڈ میرج کروانا چاہتی تھیں؟ ویری فنی... وہ بھی بیٹے کے لیے۔ بڑا اچھا پلاٹ ہے اس پر اسکرپٹ لکھنا چاہیے۔ میں عمار کو یہ آئیڈیا سناؤں گی۔“ رمشانے جلدی سے اپنے باپ کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔ رمشانہ میں چیونگم ڈالے اپنی دھن میں تھی۔ وہ کہانی کے اندر کہانی تلاش کر رہی تھی۔

”رومی بیٹا!... میں نے تمہیں ہمیشہ بیٹوں سے بڑھ کر چاہا ہے۔ تمہاری ہر خواہش پوری کی ہے۔ تمہارا ہر فیصلہ مانا ہے۔ سچ کہوں میں بھی سکندر سے تمہارے رشتے کے حق میں نہیں تھا۔ میرے تمہاری ماما

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

والے اعتراضات نہیں تھے۔ ذات... برادری... فرقہ وغیرہ۔

میرے ابا جی کہا کرتے تھے:

”شادی دو لوگوں کے درمیان نہیں ہوتی۔ دو خاندانوں کے درمیان ہوتی ہے۔“

سکندر اچھا لڑکا، خاموش اور گہرا۔ اُس میں بے شمار خوبیاں ہیں جنہیں تم بھی نہیں جانتی۔ وہ جو نظر آتا ہے اُس سے بہت مختلف ہے۔ مجھے اعتراض اُس کے گھر والوں کی وجہ سے تھا۔ سعید نے ساری زندگی نانکہ بھابھی کی ہاں میں ہاں ملائی ہے۔ شازیہ نے پسند کی شادی کی تھی۔ اُس کا میاں نکٹو ہے۔ وہ سسرال کے رحم و کرم پر ہے۔ شازیہ اسی لیے اپنی ماں کی ضرورت سے زیادہ خوشامد کرتی ہے۔ ایسے گھروں میں کرسی کی جنگ ہوتی ہے۔ تم ٹھہری رائٹر، ڈائریکٹر اور تمھاری ساس گھر کی پڑ پوسر تمھارے لیے بہت بڑا چیلنج ہوگا نانکہ بھابھی کے ساتھ ایڈجسٹ کرنا۔“

”پھر آپ اس رشتے پر ایگری کیوں ہو گئے تھے؟“ رمشا نے افسردگی سے پوچھا تھا۔ چیونگم اُس نے منہ سے نکال کر ڈسٹ بین میں پھینک دی تھی۔

”رومی بیٹا...! صرف تمھاری خوشی کے لیے۔ کیوں کہ یہ تمھارا فیصلہ تھا۔ ایک وجہ اور بھی تھی۔ سکندر مجھے بہت پسند ہے۔ میری شادی میرے ابا جی نے میری مرضی کے خلاف کی تھی۔ میری محبت کوئی اور تھی۔ ابا جی کا فیصلہ درست ثابت ہوا تھا۔ تمھاری ماں بہت اچھی لائف پارٹنر ثابت ہوئی۔ پھر بھی ساری زندگی اپنی محبت کو نہ پانے کا افسوس رہا۔ جسے میں محبت کرتا تھا وہ تین دفعہ طلاق لینے کے بعد چوتھی بار بیوہ ہوئی ہے۔“

رومی کے بچھے ہوئے چہرے پر تھوڑی دیر کے لیے حیرت کے چراغ جلے تھے جن میں سے کچھ دیپ وقتی خوشی کے بھی تھے۔

”تمھاری ماما اور میری بہی لڑائی ہے۔ وہ چاہتی تھیں کہ تمھارا رشتہ میں کروں اپنی مرضی سے، تمھاری خالہ کی طرف نہ سہی کسی اور جگہ مگر فیصلہ میرا ہو۔ میں نے اُسے کئی بار سمجھایا کہ یہ میرا ہی فیصلہ ہے۔ بس میں نے رومی کی خوشی کا خیال رکھا ہے مگر اُسے یقین نہیں آتا۔“

”ڈونٹ وری پاپا...!“ رمشا نے اپنے باپ سے لپٹتے ہوئے کہا تھا۔ بیٹی ہوتے ہوئے رمشا نے اپنے باپ کو تسلی دی۔

”آئی ایم افریڈ... مگر کیوں؟ یہ میرا خود کا فیصلہ تھا... پھر ڈر کیسا...“

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

پھر بھی... بی کیئر فل... مگر کس سے؟... رمشا درانی...! سکندر تمہاری
محبت ہے۔ بچپن سے تم نے اُسے چاہا ہے۔ اُسی کے متعلق سوچا
ہے۔ تمہیں تو اُس پر بڑا کونفیڈنٹس ہے پھر کس سے ڈر رہی ہو۔
سکندر سے یا اپنے فیصلے سے... سکندر ہی تمہارا فیصلہ تھا اور تمہارا
فیصلہ بھی تو سکندر ہی ہے... پاپا نے کہا تھا اُس کی می پرانے ذہن
کی عورت ہے... تم آج کی جنریشن ہو... مگر سکندر مجھے سمجھتا نہیں
ہے... ڈونٹ ووری رمشا... ایوری تھنگ ول بی فائن...“

رمشا درانی اپنے بستر پر لیٹی ہوئی خود سے ہی جنگ کر رہی تھی۔ وہ خود ہی سوال کرتی اور خود ہی اپنی
مرضی کے جواب دے رہی تھی۔ وہ خود ہی خدشوں کی آگ جلاتی پھر خود ہی تسلی کا پانی اُس پر ڈال کر بجھا دیتی۔
یہ سلسلہ رمشا کے نیند کی آغوش میں جانے تک جاری رہا۔ اگلے ویک اینڈ پر وہ پھر سکندر سے ملی تھی۔
”تم کب اپنا کام چھوڑ رہی ہو؟ ایک ماہ رہ گیا ہے ہماری شادی میں۔“ سکندر نے پہلا سوال یہی
پوچھا تھا۔

”سکندر...! سکندر...! تم سمجھتے کیوں نہیں۔ یہ کام نہیں ہے۔ یہ میرا پیشن ہے میرا اور میرے
دوستوں کا Pixels Productions ہمارا خواب تھا جو ہم سب نے مل کر پورا کیا ہے۔ ہم سب کچھ کرنا
چاہتے ہیں۔“

”اُلٹے سیدھے کمرشل بنا کر کیا کر سکتے ہو تم لوگ؟“ سکندر نے بگڑتے ہوئے کہا۔
”تمہارا پروڈکشن ہاؤس سینکڑوں کمرشلز بنا چکا ہے کون جانتا ہے تمہیں اور تمہارے اُن بے وقوف
دوستوں کو، اگر تم کچھ کرنا ہی چاہتی ہو تو مجھے جوائن کر لو بزنس کمیونٹی میں۔ میری ایک ساکھ ہے جیمبر آف
کامرس میں میرا اور میری کمپنی کا ایک مقام ہے۔ دنیا بزنس مینوں کو جانتی ہے۔ تمہارے جیسے بے وقوفوں کو
نہیں۔“ سکندر نے یہ سب رمشا کو روکھے لہجے میں کہا تھا۔ اُس کے بعد اُس نے اپنی آنکھیں رمشا کے چہرے
پر جمادیں۔

”مسٹر سکندر...! کمپنیشن بزنس اور آرٹ کا نہیں ہے میری اور تمہاری بات ہے۔ تم بزنس کرو اور
مجھے میرا کام کرنے دو۔“ رمشا نے تحمل سے جواب دیا تھا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”کبھی پیشن کہتی ہو اور کبھی کام کہتی ہو۔ میں آٹھ گھنٹے کے لیے آفس جاتا ہوں۔ کام زیادہ ہو تو دو چار گھنٹے اور سہی۔ تمہارا کیسا کام ہے نہ دن کا پتا نہ رات کی خبر۔ یہ پیشن نہیں پاگل پن ہے۔“ سکندر نے سختی سے کہا تھا۔

”سکندر تمہیں کتنے لوگ جانتے ہیں؟“ رمشا نے سکندر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ سکندر کے چہرے پر کئی سوال تھے۔ اس بار رمشا کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

”میں بتاتی ہوں... سو ڈیڑھ سو کے قریب بزنس مین اور باقی تمہاری فیکٹری کے آٹھ نو سو دو کر ٹوٹل ایک ہزار، یہ ہے تمہاری شہرت کا عالم۔ جہاں تک میرا سوال ہے میں یہ شہرت کے لیے نہیں کرتی۔ مجھے یہ کام کر کے مزہ آتا ہے۔ ہر پروجیکٹ میں نئے لوگوں سے ملنا... نئی جگہ شوٹ کرنا... ٹریول کرنا... سردی گرمی... بہار خزاں کو کیمرے کی آنکھ کے ساتھ ساتھ اپنی آنکھوں سے دیکھنا... محسوس کرنا... میں نے رات کے پچھلے پہر کی سنجیدگی بھی دیکھی ہے اور صبح کا سکون بھی جلتی دو پہروں کا جوش بھی دیکھا ہے اور گرجتی برستی راتوں کا خوف بھی... سردی میں ٹھٹھرتی زندگیاں بھی دیکھی ہیں۔ جسے تم پاگل پن کہتے ہو یہ زندگی کو قریب سے دیکھنے کا طریقہ ہے۔“ رمشا کو اپنی فلم کا اسکرپٹ زبانی یاد تھا۔

”سکندر... پلیز ڈونٹ مائنڈ...! تم صبح آٹھ بجے ایک آفس میں آتے ہو اور شام پانچ بجے گھر واپس چلے جاتے ہو۔ مہینہ میں ایک دو بزنس ٹور کر لیتے ہو۔ میں ایسی زندگی نہیں گزار سکتی۔ میں زندگی کو موت سے پہلے پہلے انجوائے کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے رات پاپا کی ایک بات بہت اچھی لگی۔ انھوں نے کہا:

”رمشا...! تمہاری زندگی ہے اس لیے میں نے تمہیں یہ اختیار دیا تھا کہ تم خود اپنا لائف پائز چنو۔“ میں نے تمہیں سلیکٹ کیا تھا۔ ہم جب بھی ملتے ہیں تم یہ فضول باتیں لے کر بیٹھ جاتے ہو۔ تم نے کبھی بھی رومینٹک بات نہیں کی۔ سم تھنگ نیو سکندر پلیز...! یہ فضول بحث مت چھیڑا کرو۔“

”بی پریکٹیکل رمشا...! اکارڈنگ ٹو مائی نالج... تم تو ایسی نہیں تھی۔ تم دوسری لڑکیوں سے بہت مختلف تھی اسی لیے تم مجھے پسند آئی۔“

”اور اب تم مجھے بدلنا چاہتے ہو؟ ٹیل می سکندر...! تم لڑکوں کو گرل فرینڈ ایک دم ماڈرن چاہیے اور بیوی سیدھی سادھی ہاؤس وانف۔ ایسا کیوں ہے؟ میں جیسی ہوں... ویسی ہی رہنا چاہتی ہوں۔ لڑکی کتنی ہی ماڈرن اور ویسٹرن کیوں نہ ہو جائے اُسے خود کی تعریف اچھی لگتی ہے۔ خاص طور پر اُس کے منہ سے جسے وہ

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
دل دے بیٹھی ہو۔ میری بھی ایسی ہی خواہش ہے مگر تم ہر بار میرے کام کو ڈسکس کرنا شروع کر دیتے ہو۔
سکندر...! میں فلم Actresses نہیں ہوں... میں کیمرے کے آگے نہیں... پیچھے کام کرتی ہوں... تم اور آنٹی
کیوں نہیں سمجھتے... بہت فرق ہے...“

”فرق جو بھی ہو تم نے کمٹنٹ کی تھی کہ تم یہ کام چھوڑ دو گی۔“ سکندر نے جتنی انداز میں کہا۔
ویٹر نے ٹیبل پر کھانا لگانا شروع کر دیا تھا۔
”او کے یار...! اب ڈنر کر لیں؟“ رمشا نے ویٹر کو دیکھ کر جلدی سے کہا۔ وہ مزید بحث کے موڈ میں
نہیں تھی۔

”آج میں اور سکندر ڈنر کے لیے گئے تھے۔ میری ریل اسٹوری کا
اسکرین پلے بھی کچھ فلمی سا ہے۔ وہی ٹیبل مین جو عورت کو
قید کرنا چاہتا ہے۔ کیا سکندر کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟“ رمشا کا بال
پین رُک گیا تھا۔ اُس نے بال پین کے کیپ کو اپنی کنپٹی سے لگایا
اور سوچوں میں گم ہو گئی تھی۔

”نہیں تو... یہ میرا وہم ہے۔ سکندر ایسا نہیں سوچتا۔ وہ بس یہ چاہتا
ہے کہ شادی کے بعد میں ریسٹ کروں۔ اسے میری کیئر ہے۔
ایوری تھنگ فائن۔“ رمشا نے خود کو تسلی دی۔ بال پین کی کیپ
اُس کی کنپٹی پر ہی تھی۔

”پر سکندر نے ہمیشہ مجھے کری ٹی سائز کیا ہے۔“ ایک خیال نے
آخر دماغ پر ضرب لگائی تھی۔

”ڈونٹ ووری رمشا...! وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔“ دوسرے
خیال نے جلدی سے مرہم پٹی کر دی تھی۔ رمشا نے بال پین کی کمر
پر اپنی نازک انگلیاں جمائیں اور لکھنا شروع کیا:
”میں سکندر کے لیے اپنا کام چھوڑ دوں گی۔ وہ جو کہے گا میں ویسا
ہی کروں گی۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں اُس سے۔“

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

رمشانے اپنی ڈائری بند کی اور سو گئی۔ اگلے دن...

”رمشا...! تمہیں بریک تھرو مل رہا ہے اور تم کام چھوڑ رہی ہو۔“ عمار زیدی نے حیرت سے کہا تھا۔
”یہ شروع ہی سے ایسی ہے۔ منزل کے قریب آکر راستہ بدل لیتی ہے۔“ راؤ فرحان نے ایڈیٹنگ کرتے کرتے ہی کہا۔

”احسن...! تم یہ فلم اکیلے ہی ڈائریکٹ کر لو۔“ رمشانے حتمی انداز میں کہا۔ احسن زیدی کے چہرے پر حیرت بکھر گئی۔

”رمشایو... پر ڈیوسرز نہیں مانیں گے۔ اُنھوں نے تمہیں اور مجھے اکٹھے سائن کیا تھا۔ اب میں کیا کہوں کہ میری پاٹرناب یہ فلم نہیں کرے گی؟“ احسن زیدی نے تشویش سے جواب دیا۔

”رمشا...! کتنی اسٹرگل کے بعد ہمیں فنائرسز ملے ہیں۔ عمار اور تم نے اسکرپٹ پر کتنی محنت کی ہے۔ فرحان نے بڑی مشکل سے اُس جرمن DOP کو اس پروجیکٹ کے لیے ہائر کیا ہے۔ اگلے ہفتے سے ہم سیٹ پر جا رہے ہیں۔“ احسن زیدی نے پانی کا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کیا۔ وہ اپنی پریشانی چھپانے لگا۔

”سوری یار احسن...! ویری سوری...! سکندر کو یہ سب پسند نہیں ہے۔“ رمشانے شرمندگی سے کہا۔
”یہ تم کہہ رہی ہو جس نے ساری زندگی اپنے دل کی سنی ہے۔ رمشا یہ پروڈکشن ہاؤس تم نے ضد کر کے بنوایا تھا۔ فرحان اور عمار تمہاری ضد پر چینل چھوڑ کر آئے، میں نے آسٹریلیا جانے کا پروگرام کینسل کر دیا، یہ اتنا بڑا سیٹ آپ ہم سب کی سالوں کی محنت کے بعد بنا ہے اور تم اب اسے چھوڑنے کی بات کر رہی ہو؟“ احسن نے قدرے خفگی سے کہا تھا۔

”احسن...! تم سمجھے نہیں۔ میں اپنی انویسمنٹ کا تقاضا نہیں کر رہی ہوں۔“ رمشانے جلدی سے بات کاٹی۔

”تم نے ثابت کر دیا کہ تم ایک بزنس مین کی بیوی بننے جا رہی ہو۔“ عمار زیدی نے کچھ ناراضی سے کہا۔

”یہ تو میں نے احسن کو کہا تھا کہ تم سے بات کرے۔ ہم تینوں مل کر تمہاری رقم واپس کر سکتے ہیں۔ بات روپوں کی نہیں تمہاری ہے۔ تم اپنا ٹیلنٹ ویسٹ کرنے جا رہی ہو۔“

”رمشا...! عمار نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ اس پروڈکشن ہاؤس کو اور ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔“ راؤ

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

فرحان نے جلدی سے لقمہ دیا۔

”ایک طرف میری محبت ہے اور دوسری طرف میرے خواب... میرے خوابوں میں سے ایک خواب میری محبت بھی تھا... اب محبت کو چھوڑتی ہوں تو خواب پورے نہیں ہوتے... محبت نے میرا ایک خواب تو پورا کر دیا... اس لیے میں دوسرے خوابوں سے دست بردار ہوں۔“ رمشا نے بڑی اچھی اکیٹنگ کی۔

”رمشا کی بچی...! تجھے سارے ڈائلاگ یاد ہیں۔“ عمار زیدی نے خوشی سے کہا۔

”عمار...! یاد کیوں نہ ہوتے۔ ڈائریکٹر جب تک کریکٹر کو سمجھ نہیں پاتا وہ اُسے پردے پر لائیں سکتا۔ میں تمکنت والے کریکٹر کے ساتھ جیتی ہوں۔ تم نے بہت اچھا لکھا ہے۔ تمکنت والا کریکٹر ساری اسٹوری اسی کے گرد گھومتی ہے۔“

”میں نے لکھا...؟“ عمار نے حیرت سے کہا۔

”رمشا...! یونو یہ تمہاری اسٹوری ہے۔ میں نے تو اسکرین پلے اور ڈائلاگ لکھے ہیں۔“

وہ چاروں اپنے گلے شکوے بھول کر اپنی فلم کے کرداروں کو ڈسکس کرنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ یہ بھول ہی گئے کہ رمشا اس پروجیکٹ کو چھوڑنے والی ہے۔

”رمشا...! اتنا اچھا اسکرپٹ تم دونوں کی محنت کا ثمر ہے... کیوں فرحان؟“ احسن زیدی نے اپنا نقطہ

نظر بیان کیا۔

”بس... یہ تو ہے۔“ راؤ فرحان نے چند لمحے LCD سے نظریں ہٹائی تھیں۔ وہ پھر اپنے کام میں

مشغول ہو گیا۔

”زندگی کے بعد... موت سے پہلے“ یہ ٹائٹل بھی رمشا کا ہی تھا۔ میں نے تو اس کہانی کا نام ”ست

رنگی زندگی“ رکھا تھا۔ تمکنت والا کریکٹر بھی رمشا کی وجہ سے ہی بن پایا ہے۔“ عمار زیدی نے ایمان داری سے

اعتراف کیا۔

”نو... نو... نو...! یہ عمار تمہاری محنت ہے۔ تمکنت نے اُردو لٹریچر پڑھا ہے اور وہ شعر بھی کہتی ہے۔

میں کہاں اچھی اُردو لکھ سکتی ہوں۔ اسپیشلی اس کردار کے ڈائلاگ اُسم۔ وہ تم ہی لکھ سکتے تھے۔ میرے اور

احسن کے استاد سید منصور کہا کرتے تھے کہ رائٹر ہمیشہ معصوم آدمی ہوتا ہے۔ چالاک ایڈیٹر ہوتا ہے۔ ڈائریکٹر

ہمیشہ ذہین آدمی بن سکتا ہے بے وقوف نہیں۔ کیوں احسن یاد ہے نا؟“ رمشا نے احسن زیدی کی طرف دیکھتے

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
ہوئے کہا۔ وہ اُن دنوں کو یاد کر رہی تھی جب وہ اور احسن مشہور فلم ڈائریکٹر سید منصور کے اسٹنٹ ہوا کرتے
تھے۔

”ہاں... ہاں...“ احسن نے فوراً کہا۔ وہ دوبارہ سے بولا مسکراتے ہوئے۔

سید منصور کہا کرتے تھے:

”احسن...! تم بے وقوف ہو اور رمشا ذہین۔ دونوں ٹائٹل سرجی نے دیے تھے۔ دو میں دیتا ہوں۔
فرحان چالاک ہے اور عمار معصوم۔“ احسن زیدی نے بھی ماضی کی کھڑکی کھولی تھی تھوری دیر کے لیے پھر وہ کہنے
لگا۔

”رمشا درانی...! ہمیں تمہاری ضرورت ہے تم ہمیں چھوڑ کر مت جاؤ!“

”یار میں خود کچھ کرنا چاہتی ہوں پر سکندر کو کون سمجھائے۔ وہ کہتا ہے کہ شادی سے پہلے کام چھوڑ
دو۔“ رمشا نے سپنوں سے بھری ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا تھا۔

”میرے پاس ایک آئیڈیا ہے۔“ فرحان نے گردن موڑی اور اُن تینوں کی طرف متوجہ ہوا۔

”تم آفس میں آتی جاتی رہا کرو۔ ہم انویسٹرز کو بھی نہیں بتائیں گے۔ تم ہفتے میں ایک دو دن سیٹ
پر گزار لیا کرو اور سکندر سے بھی کہہ دو کہ تم نے کام چھوڑ دیا ہے۔ اس طرح سکندر بھی خوش ہو جائے گا اور
انویسٹرز کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”فرحان نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔“ عمار نے جلدی سے فرحان کی بات پر تصدیق کی مہر لگا دی۔

”اٹ از بیئر...!“ احسن نے رمشا کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ وہ رمشا کو مشورہ
دے رہا تھا یا خود کو تسلی۔ بس اُس نے جلدی سے کہہ دیا۔

”آئی ویل سی۔“ رمشا نے کالا چشمہ لگاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اپنے آفس سے جا چکی تھی۔ کالا چشمہ
لگانے سے بھی حقیقت سفید ہی رہتی ہے۔

”یہ کیا دیکھے گی...؟“ احسن نے رمشا کے جانے کے بعد کہا۔

”رمشا غرور بہت کرتی ہے پر مغرور نہیں۔“ راؤ فرحان نے معصومیت سے LCD پر نظریں جمائے

ہی کہہ دیا۔ اُس کی بات سن کر احسن اور عمار نے ہنسنا شروع کر دیا تھا۔

”کیا مطلب ہے اس کا؟“ احسن نے ہنستے ہنستے پوچھا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”بھائی! میں سمجھا نہیں سکتا... پروہ ہے ایسی ہی۔“ راؤ فرحان اپنی بات پر قائم تھا۔

”وہ دل کی بہت اچھی ہے... مگر اُس کے مزاج میں تکبر تو ہے... تکبر کیوں نہ ہو... منہ میں سونے کا

چچ لے کر پیدا ہوئی ہے، سکندر اُس پر جان دیتا ہے۔“ عمار نے تبصرہ کیا۔

”بالکل... بالکل! میں بھی تو یہی کہہ رہا تھا۔“ راؤ فرحان نے احسن کی طرف دیکھ کر جلدی سے

کہا۔ احسن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھری۔ وہ بولا:

”اچھائی اور تکبر... وہ تو خود کو تلاش کر رہی ہے۔“

”میں کون ہوں اور کسے تلاش کرنا چاہتی ہوں۔ کیا میں محبت اور

خواب کے درمیان خود کو تلاش کر رہی ہوں۔ زندگی کے بعد...

موت سے پہلے کا وقت کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔ جب آپ

زندگی جی چکے ہوتے ہیں زندگی کی آنکھیں بند ہونے والی ہوتی

ہیں اور موت آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آپ کو ڈرا رہی

ہوتی ہے۔ موت آپ کے دروازے کے باہر کھڑی ہوتی ہے مگر

اُس کا خوف آپ کے جسم کے اندر تک ہوتا ہے۔

مجھے نہ تو میری محبت ملی اور نہ ہی میرا ایک بھی خواب پورا ہوا۔

روح نکلنے کی دیر ہے پھر میں منوں مٹی تلے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے...

پھر میرے سارے خواب دنیا ہی میں رہ جائیں گے۔“

”رمشابی بی... رمشابی بی...“ ملازمہ دروازہ پیٹ رہی تھی۔ تمکنت کا کردار جلدی سے رمشا کے اندر

سے نکل کر کاغذ کے پتوں میں گھس گیا۔ فلم کا سکرپٹ رمشا کے ہاتھ میں تھا۔ کردار تو اس کے اندر سے جا چکا

تھا پروہ کریکٹر میں ہی تھی۔

”کوثر! تمہیں ہزار بار سمجھایا ہے شور مت مچایا کرو۔“ رمشا دروازہ کھولتے ہی اپنی ملازمہ پر

بھڑکی۔

”رمشابی بی! بیگم صاحبہ نے آپ کو جلدی بلایا ہے۔“ کوثر نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

”کون سی قیامت آگئی ہے؟“ رمشا نے ترش لہجے میں کہا پوچھا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”وہ آپ کی ہونے والی ساس اور اُن کے گھر والے آپ کا مہندی والا سوٹ لے کر آئے ہیں۔“
اس بار کوثر کا موڈ بھی کچھ بہتر تھا۔ رمشا یسن کر کچھ کھوسی گئی۔ کوثر نے غور سے اُسے دیکھا۔
”رمشا بی بی...! اگر بُرا نہ منائیں تو ایک بات کہوں؟“ رمشا نے ابرو کے اشارے سے بولنے کی اجازت دی۔

”لگتا ہے آپ خوش نہیں ہیں۔ آپ کی شادی ہونے والی ہے۔ اتنے سوٹ، گہنے آپ کے لیے خریدے جا رہے ہیں۔ آپ پھر بھی کچھ بجھی بجھی سی لگ رہی ہیں۔“
”کیا سوٹ اور گہنوں سے خوشی ملتی ہے؟“ رمشا نے پوچھا۔ یہ پتا نہیں خود سے یا کوثر سے بہر حال اُس نے پوچھا تھا۔

”رمشا بی بی...! آپ تو نصیبوں والی ہو۔ پسند کی شادی، سوٹ، گہنے، اتنا سارا جہیز، سی ویو پر نیا فلیٹ، نئی گاڑی اور کیا چاہیے ہوتا ہے ایک لڑکی کو؟“ کوثر نے سارے جواب بھی خود دیے اور پھر سوالیہ نظروں سے رمشا کو بھی دیکھا۔

”محبت اور خواب زندگی کے دوران ہی زندگی کے بعد... موت سے پہلے روح نکلنے کا صرف انتظار رہتا ہے۔ صرف انتظار ہی انتظار۔“ رمشا پھر سے تمکنت کی زبان بول رہی تھی۔ انتظار سن کر کوثر کو بھی یاد آ گیا تھا کہ وہ رمشا کے پاس کیوں آئی تھی۔
”انتظار ہو رہا ہے آپ کا رمشا بی بی...! ڈرائنگ روم میں جلدی سے آجائیں۔“ کوثر نے جاتے ہوئے کہا۔

”رمشا...! تم نے بہت انتظار کروایا ہے ہمیں۔“ نائلہ نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔
”تمہیں خیال رکھنا چاہیے تھا۔ ہم کب سے ویٹ کر رہے ہیں۔“ اُسی انداز میں اُسی طرح کی بات شازیہ نے بھی کی تھی اپنی ماں کو خوش کرنے کے لیے۔ زینب نے صورتِ حال دیکھی تو فوراً بول پڑی۔
”رومی کی کل رات سے طبیعت خراب ہے۔ آپ نے گھر سے نکل کر اپنے آنے کی اطلاع دی تھی۔ میں نے رومی سے کہا بھی تھا میں منع کر دیتی ہوں پر اس نے کہا:
”نہیں ماما...! اچھا تھوڑی لگتا ہے۔ اُنھیں آنے دیں۔“ رمشا نے حیرت سے اپنی ماں کی طرف دیکھا تھا جو کہ اُس کے بچاؤ میں جھوٹ بول رہی تھی۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
”ماما! آپ نے جھوٹ کیوں بولا؟“ رمشا نے اپنی ساس کے جانے کے بعد پہلا سوال یہی پوچھا تھا۔

”تو پھر کیا کرتی؟ حد ہوتی ہے رومی...! کتنی دیر وہ سب تمہارا انتظار کرتی رہیں جب آہی گئی تھی تو اُن سے خوش اخلاقی سے مل ہی لیتی۔“
”ماما! میرا اور سکندر کا سادگی سے نکاح نہیں ہو سکتا ہے۔ تمکنت بھی دلاور سے نکاح ہی کرتی ہے۔“

”تمکنت کون ہے؟“ زینب نے تشویش سے پوچھا۔
”تمکنت میری ساتھی ہے۔“ رمشا نے کھوئے ہوئے کہا۔
”احسن تم اتنی جلدی کیوں مان گئے تھے صرف دو دن کا کام تھا۔ اب پندرہ دن بعد عائشہ رضوی آئے گی اور سارا کام بھی اُسی کا ہے۔“ عمار نے حیرت سے احسن سے پوچھا۔
”عائشہ کی رمشا سے بڑی بنتی ہے۔ فلم کا کلائمکس میں رمشا کے بغیر شوٹ نہیں کرنا چاہتا۔ کام تو دو دن کا تھا مگر اگلے دو دن رمشا کسی صورت نہیں آ سکتی۔ کل اس کی بارات ہے اور پرسوں ولیمہ اس لیے میں نے عائشہ کی بات مانی۔“

”کیا پندرہ دن بعد رمشا آ سکتی ہے؟“ راؤ فرحان نے سوال کیا۔
”رمشا بیچ کر لے گی۔ تقریباً ساری فلم اُس نے ہمارے ساتھ کروائی ہے۔“
”مشورہ کس کا تھا؟“ راؤ فرحان نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔
رمشا کی شادی ہو گئی تھی۔ اُس کے سارے دوستوں نے شادی میں شرکت کی تھی۔ رمشا بہت خوش تھی۔ ایک تو اُس کی محبت اُسے مل گئی اور دوسرا اُس کی فلم تقریباً مکمل تھی۔

”مجھے میری محبت مل گئی ہے۔ میں سکندر کے ساتھ بہت خوش ہوں۔ میرا خواب میری فلم بھی تقریباً کمپلیٹ ہے۔ فرحان نے بڑی اچھی ایڈوائس دی تھی۔ میں فلم کمپلیٹ کرنے کے بعد رائٹ ٹائم پر سکندر کو سب کچھ بتا دوں گی۔ آئی ہوپ سکندر مائنڈ نہیں کرے گا۔ آفٹر آل اب ہمارا ریلیشن مضبوط ہوا ہے۔ میرا وہم تھا

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

سکندر رومیٹک نہیں ہے۔“

”رومی...! مائی ڈارلنگ کہاں ہو؟“ سکندر نے بیڈروم میں داخل ہوتے ہی آواز لگائی۔ رمشا ٹیرس پر بیٹھی ہوئی تھی جہاں سے سمندر جھومتا، لہراتا، شور مچاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ رمشا نے سکندر کی آواز پر جلدی سے اپنی ڈائری بند کر دی۔

”تو تم یہاں ہو... یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟“ سکندر نے رمشا کو ڈائری چھپاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

”کچھ نہیں... ڈائری ہے...“ رمشا نے رُک رُک کر جواب دیا۔

”تم نے ڈائری کب سے لکھنا شروع کر دی ہے؟“

”بچپن سے۔“ رمشا نے صرف اتنا ہی کہا۔

”اکارڈنگ ٹو مائی نالج۔ بچپن میں تمہیں ڈائری لکھنے کا شوق نہیں تھا۔“ سکندر نے یقین کے ساتھ

کہا۔

”تم سے کبھی ذکر نہیں کیا۔“ رمشا نے جواب دیا۔

”ہم بھی تو دیکھیں ہماری رومی ڈائری میں کیا لکھتی ہے؟“ سکندر نے اپنے بازو کی کمان رمشا کی تیر

جیسی پتلی کمر پر ڈالی اور اُسے اپنے سینے سے لگایا۔

”سوری سکندر...! میں ڈائری تمہیں پڑھنے کے لیے نہیں دے سکتی۔“ رمشا نے اعتماد سے کہا سکندر

سے آنکھیں ملاتے ہوئے۔

”کیوں؟ ایسا کیا لکھا ہے اس میں جو میں نہیں پڑھ سکتا؟“ سکندر نے اپنے بازو کو کستے ہوئے

پوچھا۔

”وہ باتیں جو میں خود سے کرتی ہوں۔“ رمشا نے بغیر آنکھ جھپکتے ہوئے جواب دیا۔

”تمہاری باتیں سننے کے لیے بندہ حاضر ہے۔ تم اب ڈائری لکھنا بند کر دو۔“ سکندر نے جلدی سے

بات بدلی۔ دراصل وہ رمشا کے چہرے پر سنجیدگی ختم کرنا چاہتا تھا۔ اُسے رمشا پر کچھ شک تھا جو رمشا نے اُس

کی آنکھوں میں دیکھ لیا تھا۔ سکندر وہ چھپانا چاہتا تھا۔

”چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ ڈنر پر چلتے ہیں!“ سکندر نے اپنے بازو کی گرفت ڈھیلی کرتے ہوئے

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

کہا۔

”رمشا...! میں نے تمہاری ہر خواہش پوری کی ہے۔ تم نے کہا می کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ میں نے تمہارے لیے فلیٹ خرید لیا... تم ہو کہ...“ سکندر کچھ پوچھنا چاہتا تھا اگر مگر سے بات اپنا راستہ بھول جاتی۔

”سکندر...! ڈو یو ہیو اینی آنجیکشن؟“ رمشا نے سیدھا ہی کہہ دیا۔ وہ دونوں ڈنر کرنے کے بعد گھر لوٹے ہی تھے۔

”کس بات پر؟“ سکندر نے فوراً پوچھا۔

”جب سے تم نے میرے ہاتھ میں ڈائری دیکھی ہے تم مجھ پر شک کر رہے ہو۔ اب تمہارے کہنے پر میں ڈائری لکھنا تو نہیں چھوڑ سکتی۔“ رمشا نے روکھے لمبے میں کہا۔ سکندر نے زوردار تہقہہ لگایا اور رمشا کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر اپنے سامنے بیڈ پر بٹھا لیا تھا۔ رمشا نے سلکی نائی پہن رکھی تھی۔ سکندر نے کپڑے چینج کرنے تھے وہ ابھی تک بلیک ٹوپس میں ہی تھا۔

”جن دنوں میں MBA کر رہا تھا، میرے ایک ٹیچر اکثر کہا کرتے تھے:

بزنس پائزر اور لائف پائزر پر اعتماد کرنا بہت اچھی بات ہے۔ اعتماد نہ کرنا اُس سے بھی اچھی بات ہے۔ مجھے آنجیکشن تمہاری ڈائری لکھنے پر نہیں ہے، تجس یہ ہے کہ لکھتی کیا ہو ڈائری میں؟“ سکندر نے یہ سب کہا تو بڑے آرام سے تھا مگر اُس کا چہرہ بدلا ہوا تھا۔

”میری ٹیچر کہا کرتی تھیں:

اللہ سے کی ہوئی باتیں اور ڈائری میں لکھی ہوئی باتیں کسی کو بھی نہیں بتانی چاہئیں۔“ رمشا نے سکندر کی آنکھوں میں دیکھ کر اعتماد سے جواب دیا۔

”مطلب یہ ہوا تم مجھے ڈائری پڑھنے کے لیے نہیں دو گی؟“ سکندر نے سلگتے ہوئے پوچھا تھا۔

”لیس آف کورس...!“ رمشا نے اُسی اعتماد سے دو ٹوک کہہ دیا تھا۔

اُس دن کے بعد سے رمشا اور سکندر کے تعلقات خراب ہونا شروع ہو گئے تھے۔ رمشا اپنی ڈائری اپنے میکے چھوڑ آئی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ سکندر اُس کی غیر موجودگی میں وہ ڈائری ضرور پڑھے گا۔ اُس کا خیال تھا سکندر سارا فلیٹ چھان مارے گا ڈائری پڑھنے کے لیے۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

ایک دن سکندر کہنے لگا:

”رمشا...! ہماری شادی کو دو ہفتے گزر گئے ہیں۔ می نے کہا ہے اب ہمیں گھر آ جانا چاہیے۔“

”آئی نے کہا تھا:

سکندر بیٹا...! اگر تمہارے چوچلے ختم ہو گئے ہوں تو میڈم کو گھر لے آؤ!“ رمشا نے سکندر کو یاد کروایا

تھا۔

”تم فون پر میری باتیں سنتی ہو؟“ سکندر نے ناگواری سے کہا۔

”سکندر...! رات کو آئی کا فون آیا تھا۔ تم نے سمجھا میں سوئی ہوئی ہوں تم نے لیٹے لیٹے ہی اُن سے

بات کر لی تھی۔“ رمشا نے بے تاثر چہرے سے تفصیل بتائی۔

”جو بھی ہے... یہ غلط بات ہے رمشا...!“ سکندر نے برہمی کا اظہار کیا۔

”سکندر...! تم نے کئی بار میرا موبائل چیک کیا ہے۔ میں نے تو کبھی بھی تم سے گلہ نہیں کیا۔“ رمشا

نے بھی موڈ دکھایا۔ سکندر نے اپنا موبائل رمشا کی طرف بڑھا دیا بغیر کچھ کہے مگر اُس کا چہرہ بول رہا تھا۔ رمشا

کا فی دیر سکندر کو دیکھتی رہی پھر گھائل آواز میں بولی:

”سکندر...! ہماری شادی کو صرف دو ہفتے ہوئے ہیں اور ہم دونوں میں یہ ٹینشن شروع ہو گئی ہے۔

سکندر میں نے تمہاری خاطر اپنا کیرئیر چھوڑ دیا۔“ رمشا نے اپنی قربانیاں گنونا شروع کی ہی تھیں سکندر کو اپنے

بلیدان یاد آ گئے تھے۔ وہ جھٹ سے بول پڑا:

”میں نے رمشا تمہاری خاطر اپنے سارے پلان کینسل کر دیے۔ میں ہنی مون کے لیے سونز رلینڈ

جانا چاہتا تھا۔ تم نے کہا یہی کراچی میں سی ویو پر اپنا ایک فلیٹ ہونا چاہیے۔ وہ میں نے خرید لیا۔ تم نے کہا مجھے

نئی گاڑی چاہیے وہ میں نے دلوا دی پھر تم نے کہا چند دن اکیلے اسی فلیٹ میں گزارنے ہیں می سے لڑ جھگڑ کر یہ

خواہش بھی میں نے پوری کر دی۔“ سکندر نے بڑے تحمل سے بات کی۔

”ساری ٹینشن کی وجہ یہ ڈائری ہے۔“ رمشا نے غصے سے وہ ڈائری بیڈ پر سکندر کے سامنے پھینک

دی۔ سکندر نے حیرت سے رمشا کی طرف دیکھا۔

”سکندر...! اس میں ایسا کچھ نہیں ہے جس کی وجہ سے تم مجھ پر شک کرو۔“ رمشا کے آنسو نکل آئے

تھے۔ سکندر نے دیکھا تو جلدی سے رمشا کو گلے لگا لیا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”سکندر...! میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں میرے دل پر ایک بوجھ ہے میں نے تم سے کچھ چھپایا ہے میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں۔“

”یہی نا...“ زندگی کے بعد... موت سے پہلے“ کا دودن کا کام باقی ہے جسے تم میری اجازت سے پورا کرنا چاہتی ہو۔“

رمشا نے جلدی سے خود کو سکندر کی باہوں سے چھڑایا اور اُس کا چہرہ دیکھنے لگی جس پر رُعب دار مسکراہٹ تھی۔

”رمشا...! میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں... فرق صرف اتنا ہے مجھے تم لوگوں کی طرح کھٹی میٹھی باتیں نہیں آتیں اور جہاں تک ممی کی بات ہے وہ اچھی ہیں یا بُری ہیں۔ میری تو آخر ماں ہیں۔ ڈیڈی نے ہماری خاطر اُن کی ہر اچھی بُری بات برداشت کی۔ میں اتنا تنگ نظر نہیں ہوں۔ وہ تو ممی کو تمہارا کام بالکل پسند ہے اُنہوں نے صرف اس شرط پر ہماری شادی کے لیے ہاں کی تھی کہ تمہیں اپنا کام چھوڑنا پڑے گا۔“ سکندر کے چہرے پر اطمینان تھا مگر رمشا اب تک حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”ایک بات تو بتاؤ... تمہاری فلم کا END کیا ہے؟“ سکندر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”تمہیں یہ سب کچھ کیسے پتا ہے؟“ رمشا نے کافی دیر بعد سکندر سے صرف اتنا پوچھا۔

”جب تم نے اپنے دوستوں کو فلم چھوڑنے کا کہا تھا اُس کے بعد فرحان نے تمہیں آئیڈیا دیا۔ جس پر تم نے عمل درآمد بھی شروع کر دیا پھر ایک دن احسن زیدی کا مجھے فون آیا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ احسن نے مجھے بتایا:

”سکندر بھائی...! وہ آپ کے بغیر بھی مر جائے گی اور فلم بھی اُس کی زندگی ہے۔“

میں نے احسن سے کہا: مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ رمشا...! خالی تم ہی نہیں محبت کرتی۔ اُس سے کہیں زیادہ میں بھی کرتا ہوں۔ مجھے یہ بھی پتا ہے کہ تم بچپن سے ڈائری لکھ رہی ہو۔ جس ٹیچر نے یہ کہا تھا لائف پائزر اور بزنس پائزر پر اعتماد کرنا اچھی بات ہے اور نہ کرنا اُس سے بھی اچھی بات ہے میں نے اپنے اُس ٹیچر کو ادب کے ساتھ جواب دیا تھا:

”سر...! اگر اعتماد نہیں کر سکتے تو پھر شادی بھی نہ کریں اور جہاں تک بزنس کی بات ہے وہ آپ نے کبھی کیا نہیں اس لیے اُس کا مشورہ مت دیں۔“

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

اب آتے ہیں تمھاری فلم کی طرف۔ بعض اوقات تعریف وہ کام نہیں کرتی جو تنقید کر جاتی ہے۔ میں اتنے سالوں سے تمھارے کام کی تعریف کرتا آیا ہوں۔ تم لوگ پچھلے پانچ سالوں سے فلم کی کہانی کو ہی ڈسکس کرتے رہتے تھے۔ پھر میں نے تنقید شروع کر دی۔ اسکرپٹ بھی تیار ہو گیا اور فلم بھی بن گئی۔“

رمشا کی آنکھیں چمک اٹھیں... وہ خوشی سے سکندر کے گلے لگ گئی۔

”تھینک یو سو مچ سکندر جانو...!“

سکندر نے رمشا کو فلم مکمل کرنے کی اجازت دے دی۔ رمشا نے اپنا کام دل جمعی سے کیا۔ چند ماہ بعد آخر وہ دن آ ہی گیا جس کا رمشا نے بچپن سے خواب دیکھا تھا۔ بڑے پردے پر اپنے کام کو دیکھنا۔ اس عرصے کے دوران سکندر نے جیسے تیے کر کے اپنی ماں کو راضی کر لیا کہ وہ رمشا کو کام کرنے دیں۔ رمشا نے پریپر سے ایک دن پہلے ہی اپنے سارے رشتے داروں کو اپنی فلم دکھا دی تھی۔

اُس کے سارے خاندان نے اُس کے کام کو سراہا، اُس کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیا۔ پریپر والے دن رمشا اپنی محبت کے ساتھ اپنے پہلا خواب دیکھنے کے لیے سینما ہال پہنچی۔

ساری فلم کے دوران رمشا اسکرین کم اور سکندر کا چہرہ زیادہ دیکھتی رہی۔ سکندر نے بغیر کوئی تبصرہ کیے خاموشی سے ساری فلم دیکھی۔

حسب توقع کریٹکس اور عوام نے فلم کو بہت سراہا۔ فلم نے پہلے ہفتے ہی کھڑی توڑ بزنس کیا۔ فلم کے ہٹ ہونے کے بعد تک سکندر نے فلم کے بارے میں اپنی رائے نہیں دی جس کا رمشا کو بے صبری سے انتظار تھا۔

”سکندر...! تم نے اپنے کمیٹیٹس نہیں دیے۔“ رمشا نے تجسس سے پوچھا۔

”کس بارے میں؟“ سکندر نے بے پرواہی سے کہا۔

”سکندر...! یونو میں فلم کی بات کر رہی ہوں۔“ رمشا نے کچھ خفگی سے کہا تھا۔

”مجھ سے روپو مت لو۔ تمہیں بُرا لگے گا۔“ سکندر نے سنجیدگی سے سمجھایا۔

”ٹیل می سکندر...! پلیز میں سننا چاہتی ہوں۔ میرے پاس تمھارے لیے ایک بہت بڑی خوش خبری

ہے۔ تم مجھے روپو دو پھر میں خوش خبری سناتی ہوں۔“ رمشا نے بچے کی طرح ضد کی۔

”ٹو دی پوائنٹ یا ڈیٹیل میں بتاؤں؟“ سکندر اچھے موڈ میں تھا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”ڈٹیل میں۔“ رمشانے جلدی سے کہا اور متوجہ ہو گئی سکندر کی طرف۔

”تمہاری فلم سوشل کو اسٹوری تھی۔ اب آتا ہوں کہانی کی طرف۔ تمکنت ایک لڑکی ہے جو اردو لٹریچر میں ماسٹر ہے۔ اُسے محبت ہو جاتی ہے اُس رکشے والے سے جو اُسے یونیورسٹی پک اپ ڈراپ کرتا ہے۔ تمکنت مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ گھر والوں کی مرضی کے برخلاف دلاور خان سے شادی کر لیتی ہے جس کا تعلق سوات سے ہے۔ دلاور خان اپنے گھر والوں کا واحد کفیل ہے۔ دلاور اپنے گھر والوں کو شادی کی اطلاع نہیں دیتا اور تمکنت کے گھر والے مرضی کی شادی کرنے پر اُس سے تعلق ختم کر دیتے ہیں۔“

سکندر بول رہا تھا اور رمشا غور سے سن رہی تھی۔ جیسے وہ دوبارہ سے فلم سکندر کے چہرے میں دیکھ رہی ہو۔

”فلم کی کہانی وقفے وقفے سے فلیش بیک میں جاتی ہے۔ تمکنت کو جب یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اب اُس کی موت آنے والی ہے بس وہ چند گھنٹوں کی مہمان ہے تب فلم شروع ہوتی ہے۔ وہ اُسی رات اپنے یونیورسٹی کے دن یاد کرتی ہے پھر اُسے دلاور سے ایک طرفہ محبت ہو جاتی ہے۔ وہ پھر دیکھتی ہے جب اُس نے اپنی ماں سے دلاور سے شادی کی بات کی تھی۔

اُس کا باپ یہ بات سن لیتا ہے وہ اس پر تشدد کرتا ہے وہ گھر سے بھاگ کر دلاور خان کے ساتھ نکاح کر لیتی ہے۔ تمکنت دلاور کے ساتھ خوش ہوتی ہے۔ تمکنت مختلف ڈائجسٹوں کے لیے لکھنا شروع کر دیتی ہے۔ جس سے گھر کا سرکٹ چل پڑتا ہے۔ دلاور اپنے رکشے کی ساری بچت سوات بھیج دیتا ہے۔ اس دوران تمکنت بیمار رہنا شروع کر دیتی ہے۔ دلاور اُس کا بہت علاج کرواتا ہے مگر بے سود۔ تمکنت کا لکھنا بند ہو جاتا ہے۔ ڈائجسٹوں سے آنے والے چیک بھی بند ہو جاتے ہیں۔ دلاور رکشہ چلاتا یا تمکنت کو ہسپتالوں میں لے کر گھومتا۔ تمکنت کی بیماری دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک دن ڈاکٹرز دلاور کو بتاتے ہیں آپ کی بیوی کا لیور ٹرانس پلانٹ کرنا پڑے گا جس کے اوپر لاکھوں روپے کا خرچہ ہے۔ یہ سن کر دلاور خان پریشان ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال میں تمکنت جینا چاہتی ہے دلاور کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ بچ جائے مگر وہ بے بس تھا وہ رکشہ چلانے والا لاکھوں روپیہ کہاں سے لاتا۔

گھر میں غربت کی وجہ سے جھگڑے شروع ہو گئے۔ دلاور کو اپنے گھر، اپنے ماں باپ اور چھوٹے بھائی بہنوں کے لیے ہر مہینے خرچہ بھیجنا ہوتا تھا۔ دلاور نے اٹھارہ گھنٹے رکشہ چلانا شروع کر دیا۔ دلاور کی مجبوری کو تمکنت اُس کی لاپرواہی سمجھ رہی تھی۔ دلاور اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے رکشہ نہ چلاتا تو سارے سلسلے کیسے چلتے۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

تمکنت کو دلاور کا ساتھ چاہیے تھا۔

پھر تمھاری فلم کا کلائمیکس آ گیا۔

”دلاور...! میں نے تمھارے لیے اپنا گھر چھوڑا۔ تمھاری محبت کی خاطر اپنے سارے خواب چھوڑ دیے۔ میں اس ملک کی بڑی ڈرامہ رائٹر بننا چاہتی تھی تم سے شادی کر کے میرا وہ خواب بھی پورا نہیں ہو سکا۔ مجھے گاڑی چاہیے تھی میں رکشے پر دھکے کھا رہی ہوں۔ میں ڈیفنس میں بنگلہ چاہتی تھی اس جھونپڑی میں مجھے رہنا پڑ رہا ہے۔ گندا پانی پی پی کر مجھے پیٹائٹس سی ہو گیا ہے۔“

”تمکنت حوصلہ کرو اللہ سب خیر کرے گا۔ ان شاء اللہ تمھارا سارا خواب بھی پورا ہوگا اور تم کو اللہ شفا بھی دے گا۔“

”رکشہ چلانے والوں کو ڈیفنس میں گھر نہیں ملتا۔“

”گھر تو گھر ہوتا ہے ڈیفنس میں ہو یا پھر سوات میں ہو۔“

”جب تک تم سوات پیسے بھیجتے رہو گے ہمارا کہیں بھی گھر نہیں بن سکتا۔ تم اپنے ماں باپ کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ آخر میں نے بھی تو اپنے والدین کو تمھارے لیے چھوڑا ہے۔“

”تمکنت...! اللہ کا خوف کرو۔ میں نے کب کہا تھا کہ تم اپنے ماں باپ کو چھوڑو۔ میں نے تو تمھیں کہا تھا اگر وہ اجازت دیں تو ٹھیک نہیں تو تم اپنے ماموں کے بیٹے سے شادی کر لینا۔

دوسرا بات: ہم اپنا اماں اور ابا کو نہیں چھوڑ سکتا ہم ان کو خرچہ بھیجے گا خواہ اس کے لیے ہمیں چوبیس گھنٹے رکشہ کیوں نہ چلانا پڑے۔“

”اگر تم اپنے ماں باپ کو نہیں چھوڑ سکتے تو پھر مجھے چھوڑ دو۔“

”ہم نے تمھیں قید تھوڑی کیا ہے۔ اگر تم ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہتا تو جاؤ تمھارا مرضی۔“

تمکنت نے اپنا دوا نیوں والا شاپر بیگ اور اپنی ڈائری کو پکڑا اور گھر سے نکل گئی۔ وہ اُسی رات واپس اپنے ماں باپ کے گھر پہنچی، اُس کی ماں نے اپنی بیٹی کی حالت دیکھ کر اُسے اندر آنے دیا، وہ اپنے کمرے میں اندھیرے میں بیٹھی ہوئی تھی جہاں روشن دان سے روشنی آرہی تھی۔ روشن دان سے اندر آتی روشنی سے فلم شروع ہوئی تھی۔ پھر وہاں ہی کہانی واپس آ گئی۔ تمکنت نے اپنی ڈائری میں لکھا:

”زندگی کے بعد... موت سے پہلے کا وقت کتنا اذیت ناک ہوتا

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

ہے۔ میری محبت، میرا خواب نہیں ثابت ہوئی۔ وہ تو میرے لیے
عذاب ثابت ہوئی۔ میں دلاور خان تمہیں کبھی معاف نہیں کروں
گی۔ دلاور خان میں مر رہی ہوں۔ اللہ کرے تم بھی مر جاؤ۔“

اس کے بعد اُس نے شاپریگ کے اندر موجود ساری گولیاں کھالیں اور اس کی ڈیبتھ ہو گئی۔ تمکنت
کی ڈیبتھ کے ساتھ ہی دلاور کا ایکسیڈنٹ ہوتا ہے اور وہ بھی مر جاتا ہے۔
یہ تھی تمہاری فلم کی کہانی۔“ سکندر نے لمبی سانس لی۔ رمشا اب اُس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔
”سکندر جانو!... یہ تو تم نے اسٹوری سنائی ہے۔ تمہارا رویو کہاں ہے؟“
”رمشا!... تمہاری کہانی اچھی تھی مگر کہانی کے اندر بہت زیادہ جھول تھے۔ اب گنتی جانا۔ پہلے تمکنت
والا کریکٹر ڈسکس کر لیں۔

تمکنت نے بھاگ کر شادی کی۔ میں یہ نہیں کہتا لڑکیاں ہمارے معاشرے میں گھر سے بھاگ کر
شادی نہیں کرتیں۔ مجھے یہ اعتراض ہے کہ اس طرح اُسے ہائی لائٹ نہیں کرنا چاہیے تھا۔
تمکنت اپنی محبت کو ساری فلم میں احسان بنا کر پیش کرتی رہی۔ رمشا!... محبت احسان نہیں ہے۔
محبت تو احساس کا نام ہے۔

تکلیف میں شکوہ کرتی رہی۔ شکوہ تب کرو جب جواب شکوہ لکھ سکو۔
عورت مکان کو گھر بناتی ہے گھر چھوڑ کر نہیں جاتی اور آپ کی تمکنت پہلے اپنے والدین کا گھر چھوڑ کر
چلی گئی بعد میں اپنا گھر بھی چھوڑ دیا۔
دلاور کے مرنے کی بددعا کی۔ محبت کرنے والے دُعا دیتے ہیں بددعا نہیں کرتے۔
تمکنت نے خودکشی کی۔ خودکشی مایوسی کی علامت ہے اور مایوسی کفر ہے۔
رمشا ڈارلنگ!... اچھا اسکرپٹ وہ ہوتا ہے جس میں Entertainment کے ساتھ ساتھ پازیتو
میج بھی ہو۔ تمہارا اسکرپٹ ہی اُلٹ تھا۔ نہ تو اس میں انٹرٹینمنٹ تھی اور نہ ہی پازیتو میج تھا۔ ڈائریکشن میں
بھی بے شمار خامیاں تھیں۔“
”بس... بس... سکندر!...“ رمشانے مسکراتے ہوئے کہا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”میں تو تمہیں ایویں سمجھتی تھی۔ خوش خبری نہیں پوچھو گے؟“ رمشانے بات بدلی۔

”تم ماں بننے والی ہو۔“ سکندر نے مسکراتے ہوئے خوش خبری خود ہی سنا دی۔

”تمہیں اس کی بھی خبر مل گئی ہے۔ میں بہت خوش ہوں سکندر...! مجھے میری محبت بھی مل گئی اور

میرے خواب بھی پورے ہو گئے۔“ رمشانے سکندر کا ہاتھ چومتے ہوئے اپنی محبت کا اظہار کیا۔

”رمشا...! تمہارا مسئلہ پتا کیا ہے؟ تم رائٹر، ڈائریکٹر ہو ہی نہیں۔ مگر تم ماننے کو تیار نہیں۔ اصل میں تم

خود میں ایک کریکٹر ہو۔ تمکنت والا کریکٹر دراصل تم خود ہی تھی۔ وہ عمار نے نہیں لکھا، تم نے خود اُس سے لکھوایا

تھا اور فلم میں ”دلاور“ تم نے مجھے بنا دیا اور اُسے بے وجہ ہی مروا دیا۔ اچھا رائٹر وہ بنتا ہے جو اپنی پرسنٹی کے

شیڈو سے نکل آتا ہے اور اچھا ڈائریکٹر وہ بنتا ہے جس کے اوپر کسی کا بھی شیڈو نہ ہو بلکہ ڈائریکٹر کو سورج کی

طرح ہونا چاہیے جس پر بھی اُس کی روشنی پڑے وہ چمک اٹھے۔

اس کہانی میں تم زندگی کے بعد... موت سے پہلے کی بے بسی دکھانا چاہتی تھی۔ جس میں تم بُری طرح

سے ناکام رہی ہو۔ وہ بے بسی سرکاری ہسپتالوں میں دیکھنے کو ملتی ہے یا پھر غربت کے مارے گھرانوں میں۔ نہ

تو تم کبھی ہسپتال گئی ہو اور نہ ہی کسی غریب مریض سے ملی ہو جس کے پاس اپنے علاج کے لیے پیسے نہیں

ہوتے... اور وہ موت کی کھائی میں نہیں گرنا چاہتا۔

رمشا...! اصل میں تمکنت تم خود ہی ہو... رمشا سے تمکنت تک...

یہ تمہاری خود ساختہ کہانی تھی۔

تمہاری نسبت احسن بڑا اچھا ڈائریکٹر ہے۔ عائشہ رضوی تمہارے ساتھ اس لیے کمفیٹیبل فیل کرتی

تھی کہ تم ایک عورت ہو۔“

”میری سمجھ میں ایک بات نہیں آرہی... اتنی خامیوں کے باوجود یہ فلم چلی کیسے؟“ رمشانے حقیقت

میں پوچھا تھا یا پھر سکندر کو خوش کرنے کے لیے کہا تھا۔

”سیدھی سی بات ہے۔ فلمیں پاکستان میں کم بن رہی ہیں، جو ماضی قریب میں بنی رہی ہیں اُن

سے بہر حال بہت بہتر ہے اور جو تم نے چالاکی کی وہ یہ تھی کہ تمکنت کو زبردستی مظلوم بنا دیا تھا۔“

”تو کیا عورت مظلوم نہیں ہے؟“ رمشانے جلدی سے پوچھا۔

”ہمیشہ عورت مظلوم نہیں ہوتی۔ میری مُمی اور شازیہ کہاں سے مظلوم ہیں؟ آئی کہاں سے مظلوم ہیں

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

اور تم خود کو ہی دیکھ لو۔

رمشا مائی ڈیرِ وائف...! جس سوشل سرکل میں ہم رہتے ہیں وہاں عورت ظالم ہو سکتی ہے مظلوم نہیں۔ اگر تم اچھی رائٹر، ڈائریکٹر بننا چاہتی ہو تو سفر کرو۔ کتابیں پڑھو اور لوگوں کو اُن کے لیول پر جا کر ملو پھر ریالٹی دیکھ سکو گی۔ در بہ در کے دھکے کھانے پڑتے ہیں پھر جا کر کہانیاں ہاتھ لگتی ہیں۔ تم نے اور عمار نے آئے سی والے روم میں بیٹھ کر ہی دلاور خان کا کریکٹر لکھ دیا تھا۔ تم دونوں زندگی میں کبھی سوات نہیں گئے ہو گے۔“

”سکندر جانو...! بس بھی کرو۔ تم نے تو میری فلم کا حشر نشر کر دیا ہے۔“ رمشا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سکندر کے سنجیدہ چہرے پر بھی مسکراہٹ نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔

”ٹیل می... تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہے؟“ رمشا نے پوچھا۔ سکندر نے لمبی سانس بھری اور ہونٹوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا:

”جب ہم دونوں نے ہوش سنبھالی تھی تو PTV کا ڈرامہ اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اُس میں سے چند ایک سانس میں نے بھی محسوس کی تھیں۔ ورلڈ کلاس کے ڈرامے PTV نے دیے ہیں۔ اس کے علاوہ پرشن سینما بھی دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ انڈیا کا آرٹ سینما بھی ٹھیک تھا۔ فلم کے حوالے سے ہالی وڈ کی تو ساری دنیا پر حکمرانی رہی ہے۔ میں نے یہ سارا کام دیکھا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں:

گھوڑی نہیں چڑھے تو کیا ہوا..... چڑھتے ہوئے تو دیکھا ہے۔“

”اور ہمارا کام؟“ رمشا نے جلدی سے پوچھا۔

”رمشا...! فلم میں ہم لوگ بہت پیچھے ہیں۔ پچھلے دس سال میں صرف تین چار ورلڈ کلاس فلمیں پاکستان میں بنی ہیں۔ اُن میں سے دو ایک ہی صاحب کی تھیں اُنھوں نے بھی PTV پر مار کھائی تھی اس لیے اُنھیں اسکرپٹ کی سوچ بوجھ ہے۔

فلم میں سب سے اہم اسکرپٹ ہی ہوتا ہے۔ حالیہ دو چار پاکستانی فلمیں دیکھی ہیں۔ سب نے یہ کیا انڈیا کی تین سے چار فلمیں اٹھائیں اُنھیں جوڑ کر ایک نئی فلم بنا ڈالی۔ انھیں وقتی کامیابی تو مل گئی ہے پر ایسی فلمیں لوگوں کے دلوں میں نہیں رہتیں۔“ سکندر خاموش ہو گیا تھا مگر رمشا اسے سننا چاہتی تھی۔

انسانی فطرت ہے وہ اپنے پسندیدہ موضوع پر گھنٹوں بات کر سکتا ہے اور سن بھی سکتا ہے۔ ایسا ہی رمشا کے ساتھ بھی تھا۔ سکندر نے کبھی بھی اس سے فلم پر بات نہیں کی تھی۔ اُس دن کی تھی تو خوب کی۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”سکندر...! ایک بات کہوں... میری بڑی خواہش تھی تم مجھ سے گھنٹوں میرے فیورٹ موضوع پر بات کرو۔ آج میری یہ ویش بھی پوری ہو گئی ہے۔“ رمشا نے جھومتے ہوئے کہا۔
”تمہاری خواہش پوری کرتے کرتے میرا گلہ خشک ہو گیا ہے۔ پچھلے ایک گھنٹے سے مسلسل بول رہا ہوں۔ صرف تمہیں خوش کرنے کے لیے۔ رمشا...! مجھے بہت سخت بھوک لگی ہے۔“ سکندر نے کہا۔
”آج کا ڈنر میری طرف سے... سالٹ اینڈ پیپر چلتے ہیں۔“ رمشا نے چپکتے ہوئے اپنا پروگرام بتایا۔

”آج نہیں... میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ میرا ڈرائیو کا کوئی موڈ نہیں ہے۔“ سکندر نے سستی سے جواب دیا۔

”ڈرائیو بھی میں کروں گی اور ڈنر بھی میری طرف سے اور کل صبح ہم گھر بھی چلے جائیں گے۔“ رمشا نے ایک کے ساتھ ایک فری والی آفر دی تھی۔ سکندر نے سنا تو وہ مسکرا اٹھا۔
”میں فرلش ہو کر آتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے سکندر چلا گیا۔ جب سکندر واپس لوٹا فلم ڈائریکٹر کسی ملکہ حسن سے کم نہیں لگ رہی تھی۔

رمشا نے سفید چوڑی دار پانچامہ اوپر فراک پہنی... ریڈ لپ اسٹک... اُس کے دودھیا چہرے پر بچ رہی تھی۔ کھلے گیسوں کچھ چھوٹے ضرور تھے مگر سیاہ رات سے زیادہ کالے تھے۔ سکندر ہمیشہ کی طرح بلیک ٹوپس پہنے ہوا تھا سفید شرٹ کے ساتھ۔

رمشا نے اپنے فیورٹ ریسٹورنٹ میں اپنی مرضی کا کھانا آرڈر کیا۔
”سکندر...! مجھے آج ایسا لگ رہا ہے میں سولہ سال کی یگ لڑکی ہوں وہ کیا کہتے ہیں اُسے دو...“

”دو شیزہ۔“ سکندر نے ہنستے ہوئے لقمہ دیا۔

”ہاں وہی دو شیزہ ہوں جو پہلی بار اپنے لور کے ساتھ ڈیٹ پر آئی ہو اور اُس کی ہارٹ بیٹ اُس کے قابو میں نہ ہو۔ اُسے اپنے لور سے ملنے کی خوشی کے ساتھ ساتھ ظالم دنیا کا ڈر بھی ہو۔ کبھی کوئی دیکھ ہی نہ لے، گھر والوں کو پتا چل گیا تو کیا ہوگا۔“

”تم واقعی سولہ سال کی لڑکی کی طرح ہی بیہو کر رہی ہو۔“ سکندر نے تعجب سے بتایا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”سکندر...! میں آج سے پہلے تمہیں سمجھ ہی نہیں پائی۔ پاپا تمہارے بارے میں ٹھیک کہتے تھے کہ جو تم نظر آتے ہو ایسے تم ہو نہیں۔“

”کیا کہا تھا انکل نے میرے بارے میں؟“ سکندر نے اشتیاق سے پوچھا۔

”وہ میں پھر بتاؤں گی آج میں تمہیں اپنے دل کا حال بتانا چاہتی ہوں۔“

”بتاؤ میں سن رہا ہوں۔“

”سکندر...! میں... ہماری شادی والے دن بھی اتنی خوش نہیں تھی۔ فلم کی ریلیز پر بھی اتنا پپی موڈ

نہیں تھا۔ آج ایسے جیسے مجھے زندگی مل گئی ہو۔“

ڈنر کرنے کے بعد وہ ریسٹورنٹ سے نکلے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے ڈرائیور سیٹ والا دروازہ کھولتے

ہوئے رمشا بولی:

”سکندر...! کیا تمہیں سکندر اعظم کی بیوی کا نام پتا ہے؟“

”نہیں تم بتاؤ۔“ سکندر نے تنگ کرنے کے لیے کہا۔

”بتاؤ نا۔“ رمشا نے گاڑی کی ڈرائیور سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ناز و انداز سے کہا۔

”رخسانہ (ROXANA) اُس کا نام تھا۔“ سکندر نے جواب دیا۔

”رخسانہ۔“ رمشا نے تصدیق کی تھی یا حیرت سے دوبارہ وہی نام دہرایا تھا۔ خدا جانے۔

”مجھے آج لگ رہا ہے تم سکندر اعظم ہو اور میں تمہاری کوئین رخسانہ ہوں۔“ رمشا کارڈرائیو کر رہی

تھی اور سکندر اُس کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا۔

گاڑی سی ویو والی سڑک پر تھی۔ میکڈونلڈ سے پہلے جو سپیڈ بریکر آتے ہیں، اُسی مقام پر ایک

لینڈ کروزر نے رمشا والی سائیڈ پر زوردار ٹکرائی۔ لینڈ کروزر والا اسپید میں تھا۔ رمشا کی کار اُلٹ گئی۔ بڑا میجر

ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔

رمشا اس حادثے میں شدید زخمی ہوئی، سکندر بھی زخمی ہوا تھا۔ چند دن بعد سکندر کو ہاسپٹل سے

ڈسچارج کر دیا گیا مگر رمشا آئی سی یو میں ہی تھی۔ اُس کی حالت انتہائی تشویش ناک تھی۔ جب رمشا کو ہوش آیا

اُس نے سکندر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

”سکندر...!! سکندر...!!“ رمشا نے رُک رُک کر کہا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

اُس کے آنسو پلکوں کے کواڑ کھول کر صحرا جیسے خشک گالوں پر گرے تھے۔
صحرا جیسے خشک گالوں کے نیچے ہونٹ ایسے، جیسے گیلی چکنی مٹی تیز دھوپ سے پھٹ جاتی ہے۔
آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے تھے، بالکل ویسے ہی جیسے بھوکے چہروں پر غربت اپنے نشان چھوڑ جاتی

ہے۔

یہ تمکنت جس کا نام رمشا تھا، اپنے سارے غرور کے ساتھ بے بسی کی تصویر بنے ہوئے تھی۔
اُس کا چہرہ کسی سا ہوکا رکا بھی کھانہ نظر آ رہا تھا جس پر کئی کھاتے درج تھے۔
انگلیاں تنور میں ڈالی جانے والی خشک شاخوں جیسی ہو چکی تھیں۔
آنکھوں میں روشنی غریب کے دیپ جتنی جس کے نیچے اندھیرا ہی رہتا ہے۔
”بولو...! میں سن رہا ہوں۔“ سکندر نے رمشا کے خشک رخساروں سے اشکوں کو صاف کیا تھا۔
”میں کب سے اس حالت میں ہوں؟“

”اٹھارہ دنوں سے.....“ سکندر نے مختصر سا جواب دیا۔
سکندر نے اپنے ہونٹوں پر اُننگی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔
”سکندر...! میں جینا چاہتی ہوں... مجھے لگتا ہے تمکنت مجھے بھی مار دے گی۔ عمار نے بہت کہا تھا
تمکنت کو نہ مارو... مگر میں دلاور کی تمکنت کو مارنا چاہتی تھی... اب وہ مجھ سے بدلہ لے رہی ہے...“
رمشا ایک بار پھر تمکنت کے کریکٹر میں کھو گئی تھی۔ سکندر کسی گہری سوچ میں تھا۔
”میں زندگی کو قریب سے دیکھنا چاہتی تھی... اب موت میرے سامنے کھڑی ہے...“ بات کرتے
کرتے رمشا کی سانس پھول گئی۔ ڈاکٹروں نے سکندر کو وارڈ سے باہر بھیج دیا۔ ٹھیک دس منٹ بعد ڈاکٹروں
نے رمشا کی ڈیٹھ کی خبر سنا دی تھی۔ رمشا نے بغیر سمجھے... بغیر دیکھے زندگی کے بعد... موت سے پہلے کے وقت
کو لکھ دیا تھا۔

قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا... اُس کا سفید سلکی جوڑا سفید اونی کفن میں تبدیل ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

میم

مزل کھانے سے فارغ ہوا تو اُس نے اپنی ROLEX کی گھڑی میں ٹائم دیکھا، تین بجنے والے تھے۔

”واپسی کب تک ہے؟“ مزل نے مبشر کے کان میں سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔
”مغرب ہو ہی جائے گی۔“ مبشر نے اُسی انداز میں بتایا۔

”OK... میں نماز کے لیے جا رہا ہوں۔ جب جانا ہو تو مجھے کال کر لینا۔“ مزل نے یہ کہا اور شادی ہال سے باہر نکل آیا۔ باہر آ کر اُس نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ جی ٹی روڈ کی دوسری جانب اُسے مین سڑک سے اندر جاتی ہوئی ایک چھوٹی سڑک پر ایک چھوٹی سی مسجد نظر آ گئی تھی۔ مزل نے اپنی وائٹ مرسدیز کی طرف دیکھا جو کہ دُہن سے زیادہ بھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد مزل نے پیدل جی ٹی روڈ کر اس کیا اور سڑک کی دوسری طرف پہنچ گیا۔

سڑک کی دوسری طرف مین جی ٹی روڈ پر صرف سرامک کی بند پڑی فیکٹری اور میم گریلز ہائی اسکول تھا۔ فیکٹری اور اسکول کے درمیان جی ٹی روڈ سے ایک چھوٹی سڑک معراج کے گاؤں تک جاتی تھی۔ اُسی سڑک پر فیکٹری کی مسجد تھی جس کا ایک دروازہ فیکٹری کے احاطے میں کھلتا اور دوسرا چھوٹی سڑک کی طرف تھا۔ مسجد کے دروازے کے سامنے اسکول کے پیچھے ایک مخروطی چھتوں والا دو منزلہ مکان بھی تھا جس کی کھڑکیاں پرانی طرز کی تھیں۔ لوہے کی سلاخوں کے پیچھے لکڑی کے تختے۔ مسجد کے دروازے کے ساتھ مسلم دواخانہ اُس کے باجو میں حکیم مسلم انصاری کا گھر۔ فیکٹری کے پیچھے آٹھ دس گھر اور بھی تھے۔ اس کے برعکس جس طرف ملن شادی ہال تھا اُس طرف کافی رونق تھی۔ شادی ہال کے ارد گرد بہت ساری دکانیں تھیں۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ منابل نے شادی ہال کے باہر کھڑی ماہم کو پیچھے سے جھنجھوڑ کر پوچھا۔

”اندر دودھ پلائی کی رسم ہونے والی ہے، مسرت کی امی مجھ سے بار بار پوچھ رہی ہیں ماہم کہاں ہے اُسے ڈھونڈ کر لاؤ، چلو میرے ساتھ...!“ منابل نے حکمیہ انداز میں کہا۔ اُس نے ماہم کو ہتھیلی سے پکڑا اور ہال کے اندر لے گئی، ماہم نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا وہ مسجد میں داخل ہو رہا تھا۔

مزل نے ظہر کی نماز ادا کی اور مسجد کو دیکھنے لگا بڑے غور سے جس کا محراب لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ مزل نے دوسری بار محراب کے اندر لکڑی کا اتنا عمدہ کام دیکھا تھا۔ محراب کی طرح ہی منبر بھی اتنا ہی خوب صورت۔ سواتین کا وقت تھا جب مزل نے مسجد کے کلاک پر نظر ڈالی۔ پونے چار بجے عصر کی جماعت، اُسی ڈیجیٹل کلاک کے نیچے جماعت کے اوقات بھی درج تھے۔

مزل بیگ نے قرآن پاک الماری سے اٹھایا اور تلاوت شروع کر دی۔ ساڑھے تین بجے کے قریب ایک نصف صدی بارلش شخص مسجد کے اندر داخل ہوا۔ اُس نے اسپیکر کھول کر اذان دی۔ مزل نے قرآن پاک الماری میں رکھا اور اذان کا جواب دینے لگا۔

”پوری بارات میں سے آپ اکیلے ہی نماز پڑھنے آئے ہو؟“ مؤذن نے اذان ختم کرنے اور دُعا مانگنے کے بعد مزل سے پوچھا۔

”آپ تو وہی ہیں نا جنھوں نے نکاح پڑھایا تھا؟“ مزل نے سوال کا جواب دینے کی بجائے اپنا سوال پوچھ لیا۔

”جی جناب...! میں وہی ہوں۔ میرا نام حکیم مسلم انصاری ہے۔ لوگ حکیم صاحب کہتے ہیں۔ مسلم انصاری کوئی نہیں کہتا۔“

”ادب کی وجہ سے آپ کا نام نہیں لیتے ہوں گے۔“ مزل نے بے تاثر چہرے کے ساتھ اپنا نقطہ بیان کیا۔

”میرا نام مزل بیگ ہے اور میں...“

”آپ مبشر کے سیٹھ ہیں۔ مبشر آپ کا ڈرائیور ہے اور آپ لاہور سے آئے ہیں۔ میں نے ٹھیک بتایا نا؟“ حکیم صاحب نے مسکراتے ہوئے تفصیل بتائی۔

”حکیم صاحب...! جماعت کا وقت ہو گیا ہے۔“ مہتاب خان نے اقامت کے لیے کھڑے ہوتے

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

ہوئے اطلاع دی۔ تین افراد نے باجماعت نماز ادا کی تھی۔ مہتاب خان نے دُعا مانگی اور مسجد سے چلا گیا۔ منزل اور حکیم صاحب نماز کے بعد کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر منزل نے اپنا موبائل دیکھا جس پر دوس کالز آئی ہوئی تھیں۔ منزل نے مسجد کی سیڑھیاں اُترتے ہوئے مبشر کو کال بیک کی، اچانک اُس کی نظر مسجد کے سامنے والے گھر کی دوسری منزل پر پڑی۔ ایک لڑکی کھڑکی میں کھڑی ہوئی منزل کو ہی دیکھ رہی تھی۔ جب منزل کی نظر اُس لڑکی پر پڑی تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔

”سرجی...! کہاں ہیں آپ؟ جلدی سے آجائیں۔“ مبشر موبائل کی دوسری طرف سے التجا کر رہا

تھا۔

”یہ ماہم کہاں مر گئی ہے؟“ مناہل اپنی اور ماہم کی سہیلیوں سے پوچھ رہی تھی۔

”کمینیو...! دودھ پلائی کی طرح پانچ ہزار پر ہی ایگری مت ہو جانا۔ دس ٹائم بیس ہزار سے کم نہیں لیں گے۔“ مناہل نے اپنی سہیلیوں کو سمجھایا۔ مناہل اور اس کی سہیلیوں نے مبشر کا گھٹنا ایک چنری سے باندھ دیا تھا۔ مبشر اپنے سرجی کو بڑا بنا کر لایا تھا گو کہ منزل بیگ اور مبشر علی ہم عمر ہی تھے پھر بھی مبشر نے اپنے رشتے داروں کی بجائے منزل بیگ پر ذمے داری کی پگڑی رکھی تھی۔

منزل بیگ جو کہ ڈرائی فروٹ کی طرح تھا۔ توانائی سے بھرپور مگر خشک، توانائی اُس کے جذبوں اور اس کی سوچ میں تھی اور خشکی اُس کے مزاج کا حصہ۔ وہ بداخلاق نہیں لیکن کوئی ایسا خوش اخلاق بھی نہیں تھا۔ ایک اتنا بڑا بزنس مین اپنے ڈرائیور کی بارات کے ساتھ آیا تھا وہ بھی خود اُس کا ڈرائیور بن کر۔ منزل بیگ من موحی تھا پہلے تو اُس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

”سرجی...! پلیز چلیں، میری کون سی روز روز شادی ہونی ہے؟“ مبشر کی عرضی میں پتا نہیں کون سی بات تھی جو منزل بیگ نے ہاں کر دی تھی۔ اب منزل خود سے کہہ رہا تھا:

”میں بھی ایڈیٹ ہوں جو یہاں آ گیا۔“

منزل کافی دیر دُور کھڑا مبشر اور دُلہن کی سہیلیوں کی بحث و تکرار دیکھتا رہا۔ وہ مبشر کی آواز پر چونکا۔

”سرجی...! میری جان چھڑائیں ان چڑیلوں سے۔“

منزل وقار سے چلتا ہوا مبشر کے پاس گیا۔

”پہلے ان چڑیلوں نے دودھ پلائی کے مجھ سے پانچ ہزار لے لیے اب میرا گھٹنا باندھ کر پورے

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
 بیس ہزار مانگ رہی ہیں۔“ مبشر ایسے بول رہا تھا جیسے کم زور بچہ اپنے سے ٹکڑے بچوں کی شکایت اپنے ماں
 باپ کو کرتا ہے۔

”جی جی...! پورے بیس ہزار دینے پڑیں گے۔“ ایک کالی کلوٹی لڑکی نے منابل کا سبق با آواز بلند
 دہرایا تھا۔

مزل نے اُس لڑکی کی طرف دیکھا اُس کا انداز بڑا عجیب سا تھا جیسے جگا ٹیکس مانگ رہی ہو۔ مزل
 کے چہرے پر ایک میٹھی مسکراہٹ اُبھری۔ سب کے زور زور سے ہنسنے کی آواز اُس کے کانوں میں پڑی۔ اُس
 نے اُس کالی کلوٹی کے چہرے سے نظر ہٹا کر سب چہروں کی طرف باری باری دیکھا سب پاگلوں کی طرح ہنس
 رہے تھے۔

”یہ بھی کوئی ہنسنے والی بات ہے؟“ مزل کے دل میں خیال آیا۔ ہنستے ہوئے چہروں کے درمیان
 ایک سنجیدہ چہرہ بھی تھا جو مزل کو ہی دیکھ رہا تھا۔ مزل اُس کا چہرہ نہیں دیکھ پا رہا تھا مگر اُس کی لمبی کی طرح جلتی
 آنکھیں اُسے نظر آ رہی تھیں جو گھپ اندھیرے میں دُور سے دیکھو تو انگاروں کی طرح دکتی ہوئی لگتی ہیں۔
 ”میں پانچ ہزار سے ایک ٹیڈی بھی زیادہ نہیں دوں گا۔“ مبشر بول رہا تھا دُہن کی سہیلیوں میں
 پھنسا ہوا۔

”پندرہ... آخر...“ منابل نے انداز سے کہا۔
 ”دس...!“ مزل نے سنجیدگی سے آفر دی۔
 ”وُن...!“ منابل نے مہندی لگی ہتھیلی آگے بڑھا دی۔ مزل نے ہزار ہزار کے دس کڑکتے نوٹ
 اُس کی ہتھیلی پر رکھے۔ منابل نے نوٹ پکڑتے ہوئے مزل کے ہاتھ پر سوئی چبودی۔ مزل کو کرنٹ سا جھٹکا
 لگا۔ اُس نے جلدی سے ہاتھ پیچھے ہٹایا۔ مزل نے غصے سے منابل کی طرف دیکھا تھا۔
 رخصتی کے وقت دُہن کی ساری سہیلیاں ایک بار پھر دُہے کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں تھیں۔ جب
 وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے لگا۔

”رستہ روکنے کی رسم تو بارات آنے کے وقت ہوتی ہے۔“ مبشر کی بہن منیبہ نے کہا۔
 ”اُس وقت ہم بھول گئے تھے۔“ وہ کالی کلوٹی پھر بولی اپنے مخصوص انداز کے ساتھ۔
 ”آپ سب ادھر آئیں۔“ مزل نے سب لڑکیوں سے کہا تھا۔ پچھلی سیٹ پر دُہن کے ایک طرف

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
 مبشر اور دوسری طرف مبشر کی ماں بیٹھ گئی، اگلی سیٹ پر مبشر کی چھوٹی بہن منیہ بیٹھی، جو دسویں میں پڑھتی تھی۔
 اب لہن کی سب سہیلیوں نے منزل کو گھیرے ہوا تھا جو کہ پیسوں کا مطالبہ کر رہی تھیں۔
 ”تم میں سے کل ویسے میں کون کون آرہی ہے؟“ آدھے ہاتھ کھڑے ہوئے۔
 ”کل ویسے پر میرا دوست حمزہ علی عباسی بھی آرہا ہے۔ تم میں سے کون کون اُس سے ملنا چاہتی ہے؟“

کسی نے بھی گرم جوشی نہیں دکھائی۔
 ”تم میں سے کسی نے بھی پیارے افضل ڈرامہ نہیں دیکھا؟“ منزل بیگ حیران تھا۔
 ”پیارے افضل۔“ ”پیارے افضل۔“ چند دبی دبی آوازیں نکلیں۔
 ”حمزہ علی عباسی، مطلب ”پیارے افضل“ وہ میرا دوست ہے۔“ منزل نے سنجیدگی سے بتایا۔
 ”مسٹر منزل بیگ...! آپ ہنستے تو بالکل بھی نہیں وہ الگ بات ہے۔ آپ مسکرا کر بھی بتا سکتے تھے کہ پیارے افضل آپ کا دوست۔“
 ”ہنسنے کی ڈیوٹی معراج والوں کے ذمے ہے۔“ منزل نے سنجیدگی سے بات لگائی۔
 ”مس منابل...! کچھ غم ہونٹوں سے مسکراہٹ چھین لیتے ہیں۔“
 ”مسٹر منزل...! اگر میں کہوں جو غم آپ کو ہے وہی مجھے بھی ہے، مگر میں پھر بھی ہنستی ہوں۔“ منابل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”منزل بھائی...! چلیں بھی... ساری گاڑیاں نکل گئی ہیں۔“ منیہ کو جانے کی جلدی تھی۔
 ”پیارے افضل سچ میں آپ کا دوست ہے؟“ کالی کلوٹی نے تصدیق چاہی۔
 ”جھوٹ... یہ مذاق کر رہے ہیں۔“ منابل نے اپنی سہیلیوں کو بتایا۔
 ”سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کل ہو جائے گا، تم سب بتاؤ پیسے لینے ہیں یا پھر پیارے افضل سے ملنا ہے؟“

سب نے یک زبان ہو کر کہا:
 ”پیارے افضل سے ملنا ہے۔“
 منزل گاڑی میں بیٹھنے لگا تو اُسے سیڑھیوں سے اوپر ہال کے داخلی دروازے سے آگے وہ بلی آنکھیں

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

دوبارہ نظر آئیں جو منزل کو ہی دیکھ رہی تھیں۔

”بھائی!... پیارے افضل واقعی آپ کا دوست ہے؟“ منیبہ نے بھی اشتیاق سے پوچھا۔

”نہیں گڑیا!... وہ تو میں نے مذاق کیا تھا نہیں تو تمہارے بھائی کے دس ہزار اور چلے جاتے۔“ منزل

نے گاڑی ڈرائیور کرتے ہوئے منیبہ کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

وہ اپنے ٹیرس پر کھڑا لان میں لگے سہل اور سندری کے اونچے درختوں کو دیکھ رہا تھا جہاں اُسے وہ بلی آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ وہ ٹیرس سے کمرے کے اندر آیا۔ فریج سے پائن اپیل کے جوس کی بوتل نکالی اور منہ لگا کر پینے لگا۔ بستر پر لیٹ کر اُسے سیلنگ کے اوپر بھی اُسے اُس لڑکی کی آنکھیں ہی نظر آرہی تھیں۔ ویسے میں نہ آنے کی اطلاع اُس نے گوجرانوالہ سے واپسی پر ہی مبشر کو دے دی تھی۔

وہ ڈیفنس روڈ پر واقع اپنی فیکٹری سے دو بجے نکل آیا، نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے اپنی گاڑی موڑوے پر ڈال دی تھی۔ کالا شاہ کاکو کے مقام سے وہ موڑوے سے جی ٹی روڈ پر آگیا، مرید کے سے گزرتے ہوئے وہ کامونی کے پاس تھا۔ بیک ویو میر میں اُس نے جب بھی دیکھا وہی آنکھیں اُسے دیکھ رہی تھیں۔ منزل کو پتا ہی نہ چلا کب اُس نے گوجرانوالہ شہر سے چند کلومیٹر دور مین جی ٹی روڈ کے اوپر سراک کی بند پڑی فیکٹری کی دیوار کے ساتھ اپنی بلیک لینڈ کروزر کھڑی کی اپنی گھڑی پر ٹائم دیکھا ساڑھے تین بجنے والے تھے۔ اسپیکر پر حکیم صاحب کی آواز بلند ہوئی عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ منزل گردن جھکائے مسجد کے اندر داخل ہو گیا۔

”منزل بیگ صاحب!...“ حکیم صاحب نے منزل کو دیکھ کر حیرت سے کہا۔ منزل کے چہرے پر پھینکی مسکراہٹ ابھری۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد منزل سب سے آخر میں مسجد سے نکلا۔ اُس نے نظر اٹھائی۔ لوہے کی سلاخوں کے پیچھے لکڑی کے تختوں والی کھڑکی بند تھی۔ مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد بھی نظر کو مایوسی ملی۔ عشاء کے بعد بھی انتظار ہی ملا۔

فجر کی نماز حکیم صاحب نے پڑھائی، پانچ مقتدیوں میں سے پانچواں منزل تھا۔ حکیم صاحب اور مہتاب خان اُس مسجد کے پکے نمازی تھے۔ فجر اور مغرب کی نمازوں میں دو چار لوگوں کا اضافہ ہو جاتا، حکیم صاحب کو کچھ تشویش ہوئی منزل کو دیکھ مگر انہوں نے منزل سے کچھ پوچھا نہیں۔

سارے نمازی جا چکے تھے۔ حکیم صاحب اور منزل مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ منزل نے حکیم صاحب

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
کو سلام کیا اور مسجد سے نکلتے ہوئے نگاہ اٹھائی وہ پہلے سے کھڑکی کھولے کھڑی تھی۔ منزل کی بھی آنکھوں میں
نور اُتر آیا، وہ گردن جھکائے اپنی گاڑی میں بیٹھا اور لاہور واپس چلا گیا۔

پھر منزل کا یہ معمول بن گیا۔ وہ سارا دن اپنے کام کرتا۔ رات کو جلدی سو جاتا۔ رات کے دوسرے
پہر اُٹھتا اپنی گاڑی نکالتا اور گوجرانوالہ روانہ ہو جاتا۔ فجر کی نماز پڑھتا سب نمازیوں کے جانے کے بعد مسجد
سے نکلتا وہ کھڑکی میں نور بانٹنے کے لیے کھڑی ہوتی۔ منزل آنکھوں سے آنکھوں میں نور اُتارتا پھر گردن جھکا
کرواپس لاہور چلا جاتا۔

تین ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ حکیم صاحب کو سب کچھ پتا چل گیا تھا۔ علاقے کے لوگوں کی تشویش بڑھ
گئی۔ ایک دن علاقے کے لوگوں کو پتا چلا سیٹھ مجیب کی بند پڑی فیکٹری منزل بیگ نے خرید لی ہے۔ اعتراض
ہونے کی بجائے عرضیاں ہونے لگیں۔ منزل نے بند پڑی فیکٹری میں دوبارہ کام شروع کروا دیا۔ علاقے کے
نوجوانوں کو روزگار مل گیا۔ منزل کی علاقے میں لوگ عزت کرنے لگے۔ عزت کیوں نہ کرتے وہ اپنے کام سے
کام رکھتا تھا۔

ایک سال گزر گیا۔ منزل نماز پڑھ کر نکلتا وہ دیکھتی اور منزل گردن جھکا کر چلا جاتا۔ ایک بھی نانہ نہ تھا
دونوں اطراف سے۔ ایک دن حسب معمول سب نمازیوں کے جانے کے بعد منزل اُٹھا تو حکیم صاحب نے
اُسے روک لیا۔

”بیگ صاحب...! بیٹھ جائیں۔“ حکیم صاحب نے شفقت سے کہا۔
”آج آپ کو کھڑکی بند ملے گی۔“ منزل نے نظریں اُٹھا کر حکیم صاحب کی طرف دیکھا۔ اُس کی
نگاہوں میں کئی سوال تھے مگر وہ خاموش رہا۔ اُس نے دل میں سوچا:
”حکیم صاحب کو کس نے بتایا؟“

”بیگ صاحب...! عشق اور مشک نہیں چھپتے...!“ حکیم صاحب نے منزل کے چہرے پر بکھری
حیرت کو ختم کیا۔

”ماہم بیٹی کا کل رات کو اپینڈس کا آپریشن ہوا تھا۔ وہ اس وقت ہسپتال میں ہے۔“
منزل کے چہرے پر حیرت کی جگہ پریشانی آ بیٹھی۔

”وہ اب بالکل ٹھیک ہے منزل بیٹا...! تم فکر مت کرو۔“ حکیم صاحب نے چہرے پر بیٹھی پریشانی

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

اُٹھانے کی کوشش کی تھی۔

”اُس کا آپریشن ہوا ہے؟“ منزل نے ہولے سے پھر پوچھا۔

”منزل بیٹا...! تم میرے ساتھ آؤ، یہاں مسجد میں بات کرنا غیر مناسب ہے۔“

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد حکیم صاحب نے خود ہی بات شروع کی:

”بیگ صاحب سے منزل بیٹا اور آپ سے تم تک میں خود ہی آگیا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ تمہیں میری

بات سمجھ آجائے۔ ماہم اپنے تایا کے بیٹے ماجد کی منگیتر ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک بے جوڑ رشتہ ہے۔

ماسٹر محمود خود اس رشتے کے حق میں نہیں تھا اگر ماہم کا دادا یہ فیصلہ نہ سنا تا تو یہ رشتہ کسی صورت نہیں ہو سکتا تھا۔

ماسٹر محمود اپنے باپ کا بہت ادب کرتا تھا۔ اس لیے اُس نے آمین کہہ دیا۔

یہی حال ماہم بیٹی کا بھی ہے۔ وہ اپنے باپ سے زیادہ اپنے باپ کا ادب کرتی ہے۔ ماجد ایک

آوارہ اور بدچلن لڑکا ہے۔ ماسٹر محمود اور چوہدری مقصود کی مشترکہ زمین دوسوا ایکڑ کے لگ بھگ ہے جس کا کرتا

دھرتا ماجد ہی ہے۔

ماسٹر محمود اور چوہدری مقصود چند سال پہلے جہلم سے واپس آ رہے تھے۔ کار کا ایکسیڈیٹ ہو گیا۔

ماسٹر محمود اور ڈرائیور اُسی جگہ دم توڑ گئے۔ چوہدری مقصود کچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اُس حادثے میں اُس کی دونوں

ٹانگیں کٹ گئیں۔

ماجد اپنے گھر میں بڑا ہے ادھر ماہم سب سے بڑی ہے۔ ماہم پڑھے لکھے باپ کی بیٹی ہے۔ ماہم

خود بھی ایم اے، ایم ایڈ ہے جب کہ ماجد میٹرک فیل...

مسجد کے سامنے جو اسکول ہے یہ ماہم نے اپنے باپ سے کہہ کر بنوایا۔ اُسے گاؤں کا ماحول پسند

نہیں تھا اس لیے اپنا گھر بھی اسکول کے ساتھ ہی تعمیر کروا لیا۔ ایسے گھر عموماً پہاڑی علاقوں میں ہوتے ہیں مگر

ماہم بیٹی کو ایسا گھر ہی پسند تھا۔

مہتاب خان پہلے سیٹھ مجیب کے پاس سیکورٹی گارڈ تھا۔ ماہم کے اسکول میں اُس کی بیٹیاں پڑھتی

ہیں۔ فیکٹری بند ہونے کے بعد ماہم نے مہتاب خان کو اپنے پاس سیکورٹی گارڈ کی نوکری دے دی۔

دیکھو منزل بیٹا...! میری بات کافی لمبی ہو گئی۔ تمہاری شادی کسی صورت میں بھی ماہم سے نہیں ہو سکتی

ہے اس لیے تم کسی اور لڑکی سے شادی کر لو، حکیم صاحب نے ساری تفصیل بتانے کے بعد لگے ہاتھوں منزل

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

کو مشورہ بھی دے ڈالا۔

”اُمید کو آگ لگانے سے اندھیرے ملتے ہیں۔ حکیم صاحب...! اُمید پانی کی طرح ہوتی ہے جو کبھی بھی رحمت کے بادلوں سے برس سکتی ہے۔ میں آپ کی محبت، آپ کے خلوص کی قدر کرتا ہوں۔ میں یہ ساری باتیں بشر کی شادی کے دوسرے دن سے جانتا ہوں۔ آپ کو یاد ہو گا جس دن میں نے یہاں عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا کی تھیں اُس دن سے...“

اس بار حکیم صاحب ششدر تھے۔

”بیٹا...! اگر میں تنگ نظر ہوتا تو شاید تمہاری عبادت کو ہی منافقت قرار دے دیتا۔ تم لاہور سے یہاں نماز پڑھنے آتے ہو یا اُسے دیکھنے؟“ حکیم صاحب نے منزل بیگ کے ماتھے کے اوپر پڑے خراب کو دیکھ کر سوال کیا۔

”نماز تو میں فرض ہونے کے بعد سے پڑھ رہا ہوں۔ مجھ میں بے شمار بُرائیاں ہیں مگر نماز میں نے کبھی نہیں چھوڑی۔“ منزل بات کرتے کرتے خاموش ہو گیا۔ حکیم صاحب کو ابھی تک اپنے سوال کا جواب نہیں ملا تھا۔ وہ منزل کے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر دونوں اطراف سے خاموشی رہی۔ منزل کچھ کہنا چاہ رہا تھا آخر اُس نے کہہ دیا:

”حکیم صاحب...! میں ایک سال کا تھا میرے ماں باپ میں طلاق ہو گئی، میرے باپ نے طلاق کے بعد دوسری شادی کر لی، میری ماں نے بھی بڑی مشکل سے عدت کے دن گزارے تھے۔ اگر میری نانی زندہ نہ ہوتیں تو شاید میری ماں عدت بھی پوری نہ کرتی۔ میری ماں کے سیکنڈ پیسینڈ کی صرف ایک ہی شرط تھی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے جو میری ماں نے خوشی خوشی مان لی۔ میری ماں فارن چلی گئی اپنے سیکنڈ پیسینڈ کے ساتھ اور میرا باپ اسلام آباد سیٹل ہو گیا اپنی سیکنڈ وائف کے ساتھ۔ میری نانی بہت مذہبی تھیں۔ انھوں نے میری تربیت کی۔ میری ماں اکلوتی تھی۔ نانا نے الگ سے کافی کچھ نانی کے نام کروایا تھا۔ وہ سب کچھ نانی نے میرے نام کر دیا تھا۔ دو سال پہلے نانی کی بھی ڈیٹھ ہو گئی اب میں اکیلا رہتا ہوں۔“

”منزل بیٹا...! یہ سب کچھ میں پہلے سے جانتا ہوں پھر بھی تمہاری کہانی سن کر افسوس ہوا مگر یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“ حکیم صاحب منزل کی روداد سن کر بھی اپنا سوال نہیں بھولے۔

”آپ یہ سب کچھ کیسے جانتے ہیں؟“ منزل نے حیرانی سے پوچھا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”سب کچھ بتاؤں گا پہلے تم میرے سوال کا جواب دو۔“

”حکیم صاحب...! آپ نے کافی مشکل سوال پوچھ لیا ہے۔ جب میں لاہور سے نکلتا ہوں تو میں نے نماز کے خیال سے ہی مسجد کی طرف جاتا ہوں۔ اللہ دلوں کے حال جانتا ہے۔ جب میں مسجد کی سیڑھیاں چڑھتا ہوں تو مجھے کبھی اُس کا خیال نہیں آیا۔ ہاں...! اُترتے وقت میری نظر اٹھ جاتی ہے۔ جس پر میرا اختیار نہیں ہوتا۔ میں روز خود سے عہد کرتا ہوں اور روز ہی توڑ دیتا ہوں۔ میری نظر صرف چند سیکنڈ کے لیے اٹھتی ہے آپ کو کیسے خبر ہو گئی کیا اور لوگوں کو بھی...؟“ منزل مسلسل حیران تھا حکیم صاحب اُس کے ماضی اور حال سے باخبر تھے۔

”نہیں... نہیں... بیٹا...! میرے علاوہ کسی کو خبر نہیں۔ چھوٹے قصبوں، دیہاتوں میں نانی، دائی اور حکیم سے کم ہی باتیں چھپتی ہیں۔ دیہاتوں میں لوگ اب بھی اکٹھے بیٹھتے ہیں۔ یہاں سب کو سب کی خبر ہوتی ہے۔ میری دکان پر سارا دن عورتیں ایک دوسری کی چغلیاں کرتی ہیں، خبریں سناتی ہیں۔ لاکھ دفعہ منع کیا مگر بے سود... منزل بیٹا...! اچھی باتیں خوش بو کی طرح پھیلتی ہیں اور بُری باتیں بد بو کی طرح پھیلتی ہیں۔ دونوں ہیں بیٹا...! بڑی بات کہنا آسان ہے عمل کرنا مشکل بلکہ بہت ہی مشکل۔ کیا کہا تھا تم نے؟ اُمید پانی کی طرح ہوتی ہے جو کبھی بھی رحمت کے بادلوں سے برس سکتی ہے۔ تمہارے منہ سے بڑی بات سن کر اچھا لگا۔ اب میری بھی ایک بات یاد رکھو...! آم اور عشق جل کر ہی پکتا ہے۔“ حکیم صاحب نے تفصیل سے سمجھایا تھا جو کہ منزل کے مزاج کے برعکس تھا اُس نے کچھ خفگی سے کہا:

”حکیم صاحب...! نہ تو میں آپ کا مرید ہوں اور نہ ہی مریض۔ میں تو برنس مین ہوں۔ یہ عشق و شوق پر میرا تو یقین نہیں ہے۔ میرے پیڑنٹس بھی ایک دوسرے سے عشق کرتے تھے۔ میں اُن دونوں کے عشق کی راکھ ہوں۔“

”اُمید کی بات کرتے ہو اور خود کو راکھ بھی کہتے ہو۔ بیٹا...! اگر کہنا ہی ہے تو راکھ کی بجائے خاک کہہ لو راکھ میں مایوسی ہے اور خاک میں عاجزی۔ عشق عاجزی کے راستے کا ہی مسافر ہے۔“ اس بار حکیم صاحب نے قدرے شگفتگی سے سمجھایا۔

”حکیم صاحب...! پتا نہیں کیوں اپنی نانی کے بعد میرا دل چاہ رہا ہے کہ آپ سے سب کچھ کہہ دوں جو میرے دل میں ہے۔“ منزل کو کچھ اپنائیت کا احساس ہوا تھا حکیم صاحب کی حلیمی کی وجہ سے۔ حکیم صاحب

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

کے چہرے پر مسکراہٹ اُٹھ آئی۔

”تم کہہ سکتے ہو، میں تمہارا اپنا ہوں کوئی غیر نہیں۔ اسی لیے میں نے تمہیں بیگ صاحب کی بجائے بیٹا کہا تھا۔ تم سب کچھ کہہ دو میں سن رہا ہوں۔“

”مجھے نفرت ہے... شدید نفرت... اپنے پیرنٹس سے... وہ دونوں اپنی اپنی زندگیوں میں خوش ہیں۔ اگر میری نانی نہ ہوتی تو.....“ مزل کی آنکھیں سرخ اور اُس کی رگیں تن گئیں۔

”اُن کے ہونے نا ہونے سے نو پرافٹ... نولوس...“

حکیم صاحب نے مزل کو ایک گلاس پانی دیا:

”یہ پی لو مزل بیٹا...!“

مزل نے غٹا غٹ پانی پی لیا۔

”کتنے سیل فش تھے وہ دونوں۔“

”مزل بیٹا...! تم واقعی اچھے بزنس مین ہو۔ رشتے فائدے اور نقصان سے ماورا ہوتے ہیں۔ تم رشتوں کو بھی فائدے اور نقصان کی طرح دیکھ رہے ہو۔ ماہم کی سوچ تم سے مختلف ہے۔ کل دوپہر کو مریم بہن آئی تھی میرے پاس۔ ماہم کے پیٹ میں درد تھا۔ میں گھر چلا گیا۔ میں نے مریم بہن سے کہا آپ نیم گرم پانی لے کر آئیں۔ وہ پانی لینے چلی گئیں۔ میں نے ماہم سے پوچھا:

”بیٹی...! کہو تو میں تمہارے تایا سے بات کروں کہ وہ ماجد کی دُوسری جگہ شادی کر دیں اور تمہاری... اُس لڑکے سے...“

”حکیم چاچا...! محبت کی چھری سے عشق کا گلا نہیں کاٹا جاتا۔ پتا نہیں یہ کیا ہے۔ مجھے اُسے دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ مجھے اُس کا انتظار بھی رہتا ہے۔ جب وہ مسجد میں داخل ہوتا ہے میں تب بھی اُسے دیکھ رہی ہوتی ہوں مگر اُس نے کبھی نظر نہیں اُٹھائی۔ میں کھڑکی میں کھڑے رہ کر نماز ختم ہونے کا انتظار کرتی رہتی ہوں۔ جب وہ باہر آتا ہے صرف اک نظر وہ مجھے دیکھتا ہے اُس کے بعد نظریں جھکا کر چلا جاتا ہے۔ میں نے خود ہی اپنی اس بے وقوفی کو محبت کا نام دے دیا ہے۔“

”بھائی صاحب...! یہ لیں نیم گرم پانی...“ وہ اپنی ماں کی آواز پر خاموش ہو گئی تھی۔

”میں آپ کے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔“ مریم بہن نے جاتے ہوئے کہا تھا۔ ماہم گردن

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

جھکائے بیٹھی رہی۔

”ماہم بیٹی...! تم مجھے اپنا باپ سمجھ کر بات کر سکتی ہو۔“

”حکیم چاچا...! میں آپ کو ابو کی جگہ سمجھتی ہوں اسی لیے وہ بات کہہ رہی ہوں جو میں نے امی سے بھی نہیں کہی۔ مجھے منزل سے محبت ہے مگر اپنے ماں باپ سے عشق ہے... سب سے بڑے عاشق تو ماں باپ ہی ہوتے ہیں... جو اپنی اولاد کی خاطر ہنستے مسکراتے ساری تکالیف سہہ جاتے ہیں... والدین سے بڑا عاشق تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا...“

”ماہم بیٹی...! یہ عشق ہے کیا؟“

میں ماہم کو سمجھنا چاہتا تھا۔

”حکیم چاچا...! عشق کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ میری رائے ہے عشق تو صرف ماں باپ کرتے ہیں اپنے بچوں سے۔ اللہ میاں جب اولاد کی نعمت دیتا ہے تو ساتھ ہی والدین کے سینوں پر عشق کا نزول بھی ہو جاتا ہے۔ عشق عطائی ہے... اور محبت حکمی... اللہ میاں والدین کو اولاد سے محبت کا حکم نہیں دیتا کیوں کہ وہ تو عطا کر چکا ہوتا ہے۔ ہاں اولاد کو محبت کا حکم ضرور دیتا ہے۔ میں حکم ماننے والوں میں سے ہوں۔“

”ماہم بیٹی...! ایسے والدین بھی ہیں جو اپنے بچوں سے عشق نہیں کرتے۔“

”حکیم چاچا...! میں نے تو آج تک ایسے والدین نہیں دیکھے۔“

”ماہم بیٹی...! تمہارے نہ دیکھنے سے حقیقت تو نہیں بدل سکتی۔ ایسے والدین بھی ہیں اُن میں سے چند ایک کو میں بھی جانتا ہوں۔“

”بھائی صاحب...! آپ کی چائے...!“ مریم بہن نے چائے میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”بھائی صاحب...! آپ کی پھکی نے تو کمال کر دیا ہے۔ ماہم تو بالکل ٹھیک ہو گئی ہے۔“

”مریم بہن...! یہ پیٹ کا درد نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ اپینڈس کا درد ہے۔ آپ اسے ہسپتال لے جائیں۔“

”میں مومنہ کو ابھی کہتی ہوں کہ وہ اپنے تایا جی کو فون کر دے کہ ماجد کو بھیج دیں۔“ مریم بہن یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تھی۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”حکیم چاچا!... واقعی سچ میں ایسے ماں باپ بھی ہوتے ہیں جو اپنی اولاد سے عشق نہیں کرتے؟“

”ماہم بیٹی!...! عشق کہہ لو یا پھر محبت۔ والدین کے دلوں میں اولاد کی محبت اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی ڈالتا ہے۔ یہ صحیح کہا تھا تم نے اس میں انسان کا کیا کمال ہے یہ تو میرے مولا کی ہی دین ہے۔ ہاں!...! اگر اولاد اپنے ماں باپ سے تمہارے جیسی محبت کرے یہ بڑی بات ہے۔ اُف کے بغیر... محبت اور ادب...“

”پھر بھی ایسے والدین ہوتے ہیں۔“ ماہم حیرت سے بولی۔

”ہاں!...! کچھ بد بخت اس جذبے سے زیادہ اپنی خواہشات کو اہمیت دیتے ہیں۔ اولاد کو چھوڑ کر اپنی خواہشوں، حسرتوں، حرصوں کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔“

”حکیم صاحب!...! آپ بھی کسی ایسے انسان کو جانتے ہیں جس نے اپنی اولاد کو چھوڑ دیا ہو؟“ منزل نے عجلت میں پوچھا۔

”ہاں بیٹا!...! جانتا ہوں۔ مدر، مدیر، ماریہ اور معید۔“

منزل نے حکیم صاحب کے منہ سے چار نام سنے تو اُس کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ اُس کا رخسار سرخ پڑ گیا تھا۔ اسی دوران حکیم صاحب کو کسی نے فون کیا کہ مریض کی حالت بہت خراب ہے فوراً آئیں۔

”منزل بیٹا!...! تم بیٹھو... منابل بیٹی گھر پر ہے تم اُس سے گپ شپ لگاؤ۔ میں آدھے گھنٹے تک آتا ہوں۔ معراج کے گاؤں تک جانا ہے۔“ حکیم صاحب نے کہا اور بیٹھک سے چلے گئے۔

منزل کا دماغ ماؤف تھا۔ اُس نے ہاتھ اپنی کنپٹیوں پر رکھے۔ وہ گردن جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ حکیم صاحب کے جانے کے بعد منابل بیٹھک میں آئی۔ اُس نے ناشتے کے برتن اٹھائے، میز صاف کی۔ وہ مسلسل منزل کو ٹکٹی باندھے پرکھتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ منزل کا چہرہ فق تھا۔ منابل شش و پنج میں مبتلا تھی کہ اس صورتِ حال میں منزل کو مخاطب کرے یا نہیں۔ اُس وقت وہ دونوں متضاد کیفیات میں مبتلا تھے۔ جہاں منابل کے چہرے پر سکون اور اطمینان تھا وہیں منزل کے چہرے پر کرب تھا۔ منابل کے ہونٹوں پر میٹھی مسکراہٹ تھی تو منزل کے ماتھے پر کڑوی شکنیں۔ منابل کے لیے منزل خاص الخاص تھا۔ دوسری طرف منزل منابل کی موجودگی سے بھی بے خبر تھا۔

”منزل!...! آپ کے لیے چائے لے آؤں یا پھر تایا ابو کا انتظار کریں گے؟“ منابل نے احتراماً پوچھا۔ منزل نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے منابل کی طرف دیکھا۔ منزل کرب کی وادی سے لوٹا تھا۔ اُس کے

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

سامنے منابل کھڑی تھی ہونٹوں پر مسکان سجائے ہوئے۔

”تم...!“ منزل نے تند و تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں... میں...! منابل معید انصاری۔“ اس بار منابل نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

منزل نے معید انصاری سنا تو اُس کا غصہ کم ہونے کی بجائے بڑھ گیا۔ وہ اٹھا جانے کے لیے۔

”منزل...! رُکیں...! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“

منزل اپنی جگہ سے اٹھ گیا تھا۔ وہ بیٹھنے کی بجائے وہیں کھڑا رہا۔

”مڈثر، ماریہ، مدیحہ اور معید یہ میری لائف کے ساتھ بھی جڑے ہوئے ہیں۔ میں نے ان چاروں کو

معاف کر دیا ہے۔ آپ بھی کر دیں۔“ منابل ایسے بول رہی تھی جیسے کوئی بڑی بات نہ ہو۔

”میں آپ سے اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں، وہ پھر کبھی۔ میرے پاس آپ کا موبائل نمبر ہے۔

مسرت کی ویڈنگ والے دن سے میں فون کی بجائے آپ سے مل کر بات کرنا چاہتی تھی۔“

”میں چلتا ہوں۔“ منزل نے روکھے انداز میں کہا۔ اُس کے لیے منابل کی کوئی بھی بات اہم نہیں

تھی۔

”آپ کو فون یا میسج کر سکتی ہوں؟“ منابل نے منزل کی پشت کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”ایک شرط پر... تم اُن چاروں کا ذکر دوبارہ نہیں کرو گی۔“

”آپ میری بات سے ہرٹ ہوئے ہیں۔ سوری منزل...! ڈونٹ وری میں اُن کا ذکر دوبارہ نہیں

کروں گی۔“

منزل حکیم صاحب کے گھر سے چلا گیا۔ باہر سردی بھی تھی اور دُھند بھی۔ منزل نے مسجد کی سیڑھیوں

کے پاس سے گزرتے ہوئے گردن اٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھا جو بند تھی۔ منابل بیٹھک کی کھڑکی سے بند

کھڑکی اور بے نور آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بے نور آنکھیں منزل کی تھیں اور بند کھڑکی ماہم کی۔

”یہ کیوں اُن چاروں کو معاف نہیں کر دیتا کب تک خود سے لڑتا رہے گا۔“ منابل نے خود کلامی کی۔

”کاش...! منزل کو بھی تایا ابو جیسا کوئی ملا ہوتا۔“

حکیم مسلم انصاری بھی محبت کرنے والا شخص تھا۔ منابل چند ماہ کی تھی جب حکیم صاحب کی بیوی

مہوش نے اُس کی پرورش کی ذمہ داری اٹھائی۔ حکیم صاحب کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اُنھوں نے منابل کو

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

اپنی اولاد ہی سمجھا تھا۔ دو سال پہلے حکیم صاحب کی بیوی مہوش کا انتقال ہو گیا۔

”محبت بڑے مہنگے داموں ملتی ہے اور موت مفت میں۔“ وہ خیال کی آنکھ سے اپنی نانی کو کہتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ منزل کا سر تکیے پر تھا اور جسم بستر پر مگر وہ وہاں نہیں تھا۔

”زندگی جینے کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور موت ہمیشہ بغیر مشقت کے آپ کے سامنے کھڑی ہوتی ہے۔“ ماہم نے منابل کو جواب دیا جو اُس کی تیمارداری کے لیے آئی تھی۔

”یعنی تم یہ کہہ رہی لائف کلوژ ونڈو کے دوسری طرف ہے اور ڈیٹھ روم کے اندر آپ کے سامنے۔“ منابل نے بند کھڑکی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”نہیں... میری زندگی تو کھڑکی سے نیچے مسجد کے زینوں پر کھڑی ہوتی ہے۔ مجھے جینے کی اُمید دلاتی ہے اور چوبیس گھنٹوں کے لیے غائب ہو جاتی ہے۔ میں اگلے چوبیس گھنٹے اُس لمحے کے انتظار میں گزار دیتی ہوں۔“ ماہم وال کلاک کی طرف دیکھ کر اپنے دل کا حال بتا رہی تھی۔

”منابل...! میری زندگی آٹھ گھنٹے بعد مسجد کے زینوں پر کھڑی ملے گی۔ پھر مجھے اگلے چوبیس گھنٹوں کے لیے آکسیجن مہیا کر کے چلی جائے گی۔“ ماہم نے ٹھنڈی سانس بھری جو اپنے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی اور منابل اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی۔

”منابل...! تمہیں یاد ہوگا جب تم نے مجھے گاڑی سے اُترتے ہوئے منزل بیگ کے متعلق بتایا تھا۔ میں نے اُسے دیکھا اُسی لمحے اُسے دل دے بیٹھی۔ پتا نہیں اُس میں کیا خاص بات تھی۔ شادی کی تقریب کے دوران میں اُسے ہی دیکھتی رہی۔“

”آج صبح وہ ہمارے گھر آیا تھا بتایا ابو کے ساتھ۔ میری اُس سے بات بھی ہوئی تھی۔ اُس نے بریک فاسٹ بھی ہماری طرف ہی کیا۔“ منابل نے یہ بتایا ہی تھا ماہم کے جسم میں بجلی دوڑ گئی۔ وہ درد کے باوجود اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”کیا بات ہوئی تھی؟“ ماہم نے بے تابی سے پوچھا۔

”تھنگ اسپیشل...! دراصل ہم دونوں کا ایک پرانا رشتہ ہے۔“

”کیسا رشتہ؟“ اس بار ماہم نے تشویش سے پوچھا۔

”وہ پھر کبھی بتاؤں گی... میرے پاس اُس کا نمبر ہے... بات کرو گی... ملاؤں نمبر؟“

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”نہیں...“ ماہم نے دو ٹوک کہہ دیا۔

”ماہم...! بات کرنے سے ریلیشن مضبوط ہوتے ہیں۔“ مناہل نے جانچتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بتایا۔ ماہم کے ہونٹوں پر میٹھی سی مسکراہٹ اُبھری۔

”تو کیا گونگے بہروں میں رشتے مضبوط نہیں ہوتے؟ مناہل...! میری جان...! خاموشی کی بھی ایک زبان ہوتی ہے۔“

”ماہم...! مائی ڈیئر...! تم تو زبان رکھتی ہو پھر یہ ڈم اینڈ ڈف سی محبت کیوں؟ میں نمبر ملاتی ہوں اُسے سب کچھ کہہ دو جو تمہارے دل میں ہے۔“

”جب میں اُسے دیکھتی ہوں تو نظروں ہی نظروں میں میرے دل کی ہر بات اُس کے دل میں اُتر جاتی ہے۔“ ماہم نے یقین کامل سے جواب دیا تھا۔ مناہل نے سنا تو ہکا سا تہقہہ لگایا۔

”مجھے تو تم جو لیٹ جیسی لگ رہی ہو۔ منزل کی خبر لیتی ہوں وہ رومیو ہے کہ نہیں؟“ مناہل نے یہ کہا اور منزل کا نمبر ملا دیا۔ بیپ ہو رہی تھی۔ مناہل نے موبائل کا اسپیکر اوپن کر دیا۔

”ہیلو...! منزل نے کال ریسپونڈ کی۔“

”منزل...! میں مناہل بات کر رہی ہوں۔“

”مناہل کون؟“

”مناہل انصاری۔“ مناہل نے ”انصاری“ پر زور دے کر کہا۔

”جی مناہل...! فرمائیں...!“ منزل نے بے تاثر لہجے میں پوچھا۔

”میں ماہم کے پاس گئی تھی اُس کی طبیعت کا پوچھنے کے لیے۔“ مناہل نے اتنا کہا اور خاموش ہو گئی۔ دوسری طرف سے بھی خاموشی ہی تھی۔

”منزل...! ہیلو منزل...! آپ سن رہے ہیں؟ میں ماہم کے پاس گئی تھی۔“

”وہ میں جان چکا ہوں، آپ ماہم کے پاس گئی تھیں۔“

”اُس کی خیریت نہیں پوچھیں گے؟“ مناہل نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”آپ تو ایسے ریلکس ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یونو، ماہم کا آپریشن ہوا ہے۔“

”مناہل...! آئی نو، ماہم کا آپریشن ہوا ہے۔“ منزل نے بے فکری سے جواب دیا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”میں کنفیوز ہوں یہ کیسی محبت ہے؟“ مناہل نے حیرانی کے ساتھ ہلکا سا طنز بھی کیا۔

”مناہل...! سوری ٹو سے، میں نے آپ سے کب کہا کہ میں ماہم سے محبت کرتا ہوں اور جہاں تک اُس کی طبیعت کے پوچھنے کا سوال ہے مجھے پتا ہے وہ اب بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

”آپ کو کس نے بتایا؟“ مناہل نے جلدی سے پوچھا ماہم کی طرف دیکھتے ہوئے جاچتی نظروں سے۔

”بتایا تو کسی نے نہیں۔ بس میرا دل مطمئن ہے۔ مناہل بی بی میں کچھ مصروف ہوں مزید بات نہیں کر سکتا۔“

”ماہم کی نیکسٹ منٹھ شادی ہے۔“ مناہل نے جلدی سے بڑی خبر دی۔

”بریکنگ نیوز کا شکریہ... میں جانتا ہوں۔“ مزمل نے سنجیدگی سے کہا اور فون بند کر دیا۔ مناہل نے ماہم کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر بھی اطمینان تھا۔

”انگچنٹ رنگ تم نے ماجد کی پہنی ہے اور کمٹنٹ مزمل سے...“ مناہل نے قدرے خفگی سے کہا۔

اُتنی ہی نرمی سے ماہم نے جواب دیا:

”مناہل...! نہ تو میں نے اپنی مرضی سے منگنی کی انگٹھی پہنی ہے اور نہ ہی کسی سے محبت کے وعدے کیے ہیں، یہ بھی سچ ہے کہ مجھے مزمل سے محبت ہو گئی ہے۔ نہ تو میں شادی سے انکار کروں گی اور نہ ہی اپنی محبت کا اظہار جو قسمت میں لکھا ہوگا ہو جائے گا۔“

”مناہل باجی...! حکیم چاچا آپ کو لینے آئے ہیں۔“ ماہم کی چھوٹی بہن مومنہ نے آکر اطلاع دی۔

مناہل اپنے بستر پر لیٹی ہوئی مزمل اور ماہم کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ اُن دونوں کے تصور میں گم تھی۔ خیالوں ہی خیالوں میں خود سے باتیں کر رہی تھی:

”مزمل کبھی بھی ماہم کا نہیں ہو سکتا، ماجد یہ کبھی نہیں ہونے دے گا۔ ماہم میری فرینڈ ہے۔ میں اُس کے ساتھ تو ہوں مگر میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں مزمل کو بتا دیتی ہوں کہ ماجد کتنا خطرناک آدمی ہے۔“

”مناہل بیٹی...! دودھ پی لو۔“ حکیم صاحب پاس کھڑے ہوئے مخاطب تھے۔ مناہل نے جلدی سے اپنی چادر سر پر لی اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
 ”معاف کرنا بیٹی...! دروازہ کھلا تھا میں بغیر دستک دیے اندر آ گیا۔“ حکیم صاحب نے منابل کی
 بوکھلاہٹ دیکھ کر کہا۔

”تایا ابو...! میں خود لے لیتی آپ نے کیوں تکلیف کی؟“ منابل نے خود کو نارمل ظاہر کرنے کی
 کوشش کی۔

”منابل بیٹی...! بڑوں کی بات، آملہ اور ہڑیڑ کھانے کا اثر ہمیشہ بعد میں پتا چلتا ہے... میں نے کہا
 تھا نا منزل کا یہاں آنا ٹھیک نہیں ہے۔ ہڑیڑ کی طرح حقیقت بھی اکثر کڑوی ہوتی ہے۔ مجھے پتا ہے تم یہ چاہتی
 ہو کہ ماہم اور منزل کی شادی جیسے بھی ہو بس ہو جائے۔ غلط تو غلط ہے۔ منابل...! تم نے ثابت کرنا ہے کہ تم
 حکیم مسلم انصاری کی بیٹی ہو۔ معید انصاری کی نہیں... پیٹ درد کی پھکی تو میرے پاس ہے۔ تم کھا لو یا پھر
 تمھاری سہیلی۔ بیٹی دل کے درد کی پھکی میں لاکھ کوششوں کے باوجود نہیں بنا سکا۔ ماہم میرے مرحوم دوست
 ماسٹر محمود کی بیٹی ہے اور تمھاری سہیلی بھی۔ دوسری طرف منزل بھی اپنا بچہ ہے۔

کچھ فیصلے وقت کرتا ہے، تم بھی انتظار کرو اگلے مہینے تک... اگلے مہینے کی اکیس تاریخ طے پائی
 ہے۔“ حکیم صاحب نے شفقت سے ہاتھ پھیرا منابل کے سر پر اور کمرے سے چلے گئے۔ منابل کے ہاتھ
 میں دودھ کا گلاس تھا اور اُس کی یاد میں بارات والا دن۔

منزل جب مسجد کی سیڑھیاں اتر رہا تھا حکیم صاحب نے ماہم کو کھڑکی میں کھڑے ہوئے دیکھ لیا تھا۔
 اُس کے بعد منزل کے پیچھے شادی ہال تک جاتے ہوئے بھی۔ پھر ماہم ہجوم میں سب سے پیچھے کھڑی ہو گئی
 تھی۔ حکیم صاحب نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا گھر آ کر اُنھوں نے منابل کو سمجھایا۔

”منابل بیٹی...! تم جانتی ہو وہ لڑکا کون ہے؟ وہ منزل بیگ ہے تمھارے باپ معید انصاری کی
 دوسری بیوی ماریہ کا بیٹا اور تمھاری ماں کے دوسرے خاوند مدثر بیگ کا بھی۔ منابل بیٹی مجھے فخر ہے تم پر، تم نے
 اپنے ماں باپ کو معاف بھی کر دیا اور اپنی محرومی کا طوق بھی اپنے گلے سے اتار دیا ہے مگر منزل کے ساتھ ایسا
 نہیں ہے۔ دُعا کرو ماہم اور منزل ایک دوسرے سے دُور رہیں۔“

”تایا ابو...! دادو نے بتایا تھا منزل کو شادی ہی سے نفرت ہے۔“

”منزل بیٹا...! پتا نہیں موت کب آجائے۔ یہ میری ساری پر اپڑی کے کاغذات ہیں، جو میں نے
 تمھارے نام کر دی ہے۔ زندگی کے بعد... موت سے پہلے یہ تھوڑا سا وقت ہے میرے پاس۔ میرے سینے میں

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
چند راز ہیں جو میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں۔“ ممتاز بیگم اپنے آخری وقت میں اپنے نواسے مزمل بیگ سے
مخاطب تھی۔

”میری سب سے بڑی بہن میمونہ آپا کے بیٹے مسلم انصاری اور معید انصاری ہیں۔ معید انصاری
تمہارے باپ مدثر بیگ کا سب سے قریبی دوست بھی تھا۔ دونوں نے لڑجھگڑ کر اپنی اپنی پسند سے شادی کی
تھی۔ ماریہ تمہاری ماں نے معید کو شادی کے بعد دیکھا تھا، اُسے بعد میں پتا چلا تھا کہ معید اُس کے شوہر کا
دوست ہونے کے ساتھ ساتھ اُس کی خالہ کا بیٹا بھی ہے۔ ایک دن تمہاری ماں مجھے کہنے لگی:

”ممی!... آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں معید میری خالہ کا بیٹا ہے۔ اتنا پیئڈسم اور سمارٹ بندہ وہ
مدیحہ جیسی کے ساتھ میچ نہیں کرتا۔ اگر میں نے اُسے پہلے دیکھا ہوتا تو مدثر کی بجائے معید انصاری سے شادی
کرتی۔ دوسری طرف تمہارے باپ کی نظر مدیحہ پر تھی۔ چاروں کے دل میں چور تھا۔ وہ سب روزانہ ملتے،
گھنٹوں باتیں کرتے۔ دونوں شادیوں کو ایک ایک سال گزر گیا تھا۔ تمہاری ماں اور مدیحہ دونوں مائیں بننے
والی تھیں۔ بڑی مشکل سے دونوں نے اپنے اپنے بچوں کی پیدائش کا انتظار کیا۔ تمہاری ماں کی عدت تو بڑی
مشکل سے میں نے پوری کروادی تھی۔ اُس بے غیرت مدیحہ کا پتا نہیں اُس نے عدت بھی پوری کی یا نہیں۔
مزمل بیٹا!... مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی اُن چاروں میں سے بڑا بے شرم اور بے غیرت کون تھا۔ تمہاری ماں
کے کینیڈا جانے کے چند دن بعد میرا بڑا بھانجا حکیم مسلم انصاری مجھ سے اپنے چھوٹے بھائی معید انصاری کی
اس حرکت پر معافی مانگنے آیا تھا۔“ خیال کے جانے کے بعد مزمل کی زبان پر ایک نام رہ گیا ”حکیم مسلم
انصاری“ مزمل نے منہ میں کہا اور اپنے بستر سے اُٹھ گیا۔ کمرے سے ٹیرس پر آ گیا۔

”مجھے پہلے کیوں نہیں خیال آیا کہ یہ حکیم مسلم انصاری وہی حکیم مسلم انصاری ہیں۔“ مزمل نے دائیں
ہاتھ کا مکا بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مارا تھا۔ صبح کے چار بجنے والے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب مزمل گوجرانوالہ کے
لیے نکلتا تھا۔

”جاؤں یا نہ جاؤں...؟“ وہ خود سے پوچھ رہا تھا۔ دماغ اور دل کی بحث کے بعد اُس نے دل کی
بات مان لی۔

”اس سب میں حکیم صاحب کا تو کوئی قصور نہیں۔“ مزمل کے دل نے اُسے بتایا۔
”قصور وار تو وہ چاروں ہیں جنہوں نے میری اور مناہل کی زندگیاں برباد کر دیں ہیں۔“ دماغ نے

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
 بھی دل کی بات کی تصدیق کر دی۔ پہلی بار منزل کے دل میں منابل کے لیے ہمدردی جاگی تھی۔ اُسے لگا وہ بھی
 اُس جیسی ہے مگر اُس سے بہت مضبوط۔ وہ اپنے ماضی نے نکل کر حال میں جیتی ہے۔ منزل نے گاڑی کی چابی
 پکڑی اور گوجرانوالہ روانہ ہو گیا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے ماہم کی صحت یابی کی دُعا مانگی اور یہ
 دُعا بھی مانگی:

”یا اللہ...! منابل کے دل کی مرادیں پوری کر دے۔“

”یا اللہ...! ماہم کو منزل کے نصیب میں لکھ دے۔“ منابل نے منہ پر ہاتھ پھیرے اور بھاگ کر
 بیٹھک کی کھڑکی کی طرف آئی جہاں وہ ایک سال سے ماہم اور منزل کی خاموش محبت کو دیکھ رہی تھی۔
 منزل نے مسجد سے باہر قدم نکالے ہی تھے اُس کی نظریں خود بہ خود بے قرار ہو کر اُٹھ گئیں۔ سامنے
 کھڑکی میں ماہم کھڑی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں نور کے ساتھ ساتھ اُلفت، بے قراری، فکر تھی پھر بھی اُس دن
 پہلی بار ماہم کے ہونٹوں پر تبسم بھی تھا۔ وہ تبسم منابل نے بھی دیکھا۔ ماہم روز منزل کی آنکھوں میں دیکھتی اور
 منابل کو صرف اُس کی پشت ہی نظر آتی۔ اُس دن بھی اُسے منزل کی پشت ہی نظر آرہی تھی۔ منزل گاڑی میں
 بیٹھا ہوا لاہور واپس جا رہا تھا۔ پہلے بار اُسے واپسی پر ماہم کے علاوہ کسی اور کا بھی خیال آیا تھا۔ اُس نے
 موبائل پکڑا اور ایک میسج کر دیا۔

موبائل اُس کے ہاتھ میں ہی تھا ”میم“ کے نام سے اُس نے جو نمبر SAVE کیا تھا اُس سے میسج
 آیا تھا:

”سوری... منابل۔“

میسج میں صرف دو لفظ تھے۔ منابل کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ منزل نے اُسے میسج کیا۔
 ”اِس اوکے۔“ منابل نے بھی دو لفظوں کا ہی سہارا لیا۔
 منابل اُسی دن رات اُٹھ بجے کے لگ بھگ ماہم کی طرف گئی۔ منابل کو ماہم اور منزل کی فکر ہو رہی
 تھی۔

”منابل...! ایک بات بتاؤ...! تمہیں کیوں اتنی فکر ہے میری اور اپنے رشتے دار کی؟“ ماہم نے
 جانچتی نظروں سے منابل کو کرید لیا تھا۔

”کیوں ہے فکر؟ ایک کفارہ ہے... اور دوسرا احسان۔“ منابل نے کھوئے ہوئے جواب دیا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”دوستی میں کوئی احسان نہیں ہوتا۔“ ماہم نے غور سے منابل کو دیکھا۔

”ٹھیک کہا تم نے، میں تو صرف کوشش کر رہی ہوں، جو تم نے میرے لیے کی تھی۔ میں تو تایا ابو سے شاید بات بھی نہ کر سکتی۔ تم نے انہیں اگیری کر لیا تھا۔ مجھے تو خواب ہی لگتا ہے کہ میرا نکاح ہو گیا۔ وہ بھی اُس سے جسے میں نے چاہا۔“

”مجتبیٰ بھائی سے بات ہوتی ہے؟“ ماہم نے پوچھا۔

”ابھی تھوڑی دیر پہلے اُن کا فون آیا تھا، کہہ رہے تھے جلدی جلدی انگریزی بولنا سیکھ لو۔ جلد ہی میں تمہیں بلا لوں گا۔“ منابل کے چہرے پر خوشیوں کا جھرنا بہہ رہا تھا۔

”ماہم تمہاری شادی سے پہلے تو میں لندن لندن کہیں بھی نہیں جاؤں گی۔“

ماہم یہ سن کر خاموش ہی رہی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور سنگھار میز کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ ماہم کی بلی آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے۔ ماہم نے آئینے میں اپنی آنکھوں کو دیکھا جن میں نیند کی بھوک تھی۔

”آرام سے بیٹھ جاؤ۔ ابھی تو تمہارے اسٹچز بھی نہیں کھلے، کیا تمہیں درد نہیں ہو رہا ہے؟“ منابل نے حلیمی سے پوچھا تھا۔ اتنی ہی بے فکری سے ماہم نے سنگھار میز کے سامنے بیٹھے ہوئے نفی میں گردن ہلا دی۔

”درپن (آئینہ) سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی صورت ہی دکھا سکتا ہے، اُس کا درد نہیں... ایک دفعہ مجتبیٰ نے کہا تھا۔“ منابل آئینے کے سامنے بیٹھی ہوئی ماہم کے عکس کو دیکھ کر کہہ رہی تھی۔

”تم کس درد کی بات کر رہی ہو؟“ ماہم نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”وہ درد جو تمہارے دل میں ہے اور اس وقت تمہاری آنکھوں میں خون بن کر اُتر آیا ہے۔ آئی سوئیر تم ابھی رو دو تو خون کے آنسو پکیں گے تمہاری ان خوب صورت آنکھوں سے۔“

”مسز مجتبیٰ رحمان!... احسان تو تم میرا چکا رہی ہو یہ کفارہ کس کا ادا کر رہی ہو؟“ ماہم نے شعوری طور پر موضوع بدلا۔

”وہ پھر کبھی بتاؤں گی۔“ منابل نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

تم ہر بات کو پھر کبھی تک کیوں لے جاتی ہو... ابھی کیوں نہیں...“ ماہم کافی دیر منابل سے نظریں ملانے کی کوشش کرتی رہی مگر منابل نے اُس کی طرف دیکھا ہی نہیں۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”مجھے خوشی بھی ہے... اور گلہ بھی۔ خوشی اس بات کی کہ تم نے کبھی بھی اپنے والدین کو برا نہیں کہا۔ مجھے ہمیشہ یہی کہا کہ وہ مر چکے ہیں اور گلہ اس بات کا میں ساری زندگی یہی سمجھتی رہی کہ میں تمہارے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں۔ منابل مجھے احسان کا بدلہ نہیں چاہیے اور جہاں تک اپنے والدین کے گناہوں کے کفارے کی بات ہے۔ وہ تم پر بنتا ہی نہیں ہے۔ جو تمہارے والدین نے منزل کے ساتھ کیا وہی کچھ اُس کے والدین نے تمہارے ساتھ بھی کیا تھا پھر کفارہ کیسا؟ حکیم چاچا نے چند دن پہلے ہی مجھے یہ سب کچھ بتایا تھا۔“

”ماہم...! تایا ابو کہتے ہیں کہ اُنھیں مجھ پر فخر ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر انکل زندہ ہوتے تو وہ تم پر زیادہ فخر کرتے۔ ایک بگڑا ہوا شخص جو تم سے منسوب ہے تم صرف اس لیے اُس سے شادی کر رہی ہو کہ تمہارے مرحوم باپ کی زبان کا سوال ہے۔ میں نے اپنے زندہ پیڑنس کو مار دیا اور تم اپنے مرحوم باپ کو زندہ رکھے ہوئے ہو۔“

منابل کے موبائل پر میسج کی بیپ ہوئی۔ منابل نے میسج پڑھا۔ یہ دیکھو تمہارے اُس کا میسج آیا ہے۔ منابل اپنی جگہ سے اٹھی اور ماہم کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ موبائل اُس کے سامنے کیا۔ ”میم“ کے نام سے ایک نمبر SAVE تھا۔

”CAN I CALL YOU?“ میسج یہ تھا۔ ماہم نے پڑھا۔ منابل نے آنکھوں سے پوچھا۔

ماہم نے بغیر کسی جواب کے موبائل منابل کی طرف بڑھا دیا۔

”YES“ منابل نے موبائل پکڑ کر جواب ٹائپ کر دیا۔ ایک منٹ کے اندر اندر منزل کی کال آ گئی تھی۔

”ہیلو مسٹر منزل...!“ منابل نے اسٹائل سے کہا اور ساتھ ہی اسپیکر بھی اوپن کر دیا۔

”جی منابل...! کیسی ہیں آپ؟“ منزل کی آواز کمرے میں گونجی۔

”آئی ایم فائن۔“ منابل نے برٹش ایکسٹ میں جواب دیا۔

”مسٹر منزل بیگ...! آریو آل رائٹ؟ آپ ہمیشہ مجھے ”تم“ کہتے رہے۔ آج ”آپ“ پر آگئے، کوئی خاص وجہ؟“

”آج مجھے احساس ہوا ہے کہ تمہیں ”آپ“ ہی کہنا چاہیے۔“

”وہ کیسے؟“ منابل نے ماہم کو چھیڑتے ہوئے منزل سے پوچھا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
 ”مناہل...! جنہیں ہم عام سمجھتے ہیں، وہ کسی نہ کسی کے لیے خاص ہوتے ہیں اور جنہیں ہم تم کہتے
 ہیں، وہ کسی نہ کسی کے آپ ہوتے ہیں۔ خیر چھوڑیں مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“
 ”یہ تو میں نے صبح آپ سے کہا تھا۔“ مناہل نے جلدی سے بات کاٹی۔
 ”پہلے آپ کہہ لیں۔“ منزل نے سنجیدگی سے آفر دی۔
 ”آپ بولیں... میں سن رہی ہوں۔“ اس بار مناہل نے سنجیدگی سے کہا۔
 ”مناہل...! میں نے اپنے اور آپ کے والدین کو معاف کر دیا ہے۔ آج ایک مسکراہٹ دیکھ کر
 مسکرانے کو جی چاہتا ہے۔“

”اگر وہ مسکراہٹ والی کسی اور کی ہو گئی تو؟“ مناہل نے ماہم کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”تو... میں اُس مسکراہٹ کے سہارے ہی زندگی گزار لوں گا۔“ منزل نے ہولے سے جواب دیا۔
 ”مسٹر منزل بیگ...! ایف یو ڈونٹ مائنڈ۔ مجھے تو آپ دونوں پاگل سے لگتے ہو۔ کافی آؤٹ آف
 فیشن قسم کی محبت ہے۔ میں آپ دونوں کو ملانا چاہتی ہوں، کسی طرح کی بھی ہیلپ چاہیے ہو تو میں حاضر
 ہوں۔“ مناہل نے اپنی خدمات کی آفر دے دی۔
 ”ایک طرف ماسٹر محمود صاحب کی طے کی ہوئی نسبت ہے اور دوسری طرف میری محبت۔ دیکھتے ہیں
 جیت کس کی ہوتی ہے۔“ منزل ہم کلام تو تھا مناہل سے، سن سب کچھ رہی تھی ماہم محمود۔
 ”اگر نسبت ٹوٹ جائے تو... محبت خود بہ خود جیت جائے گی۔“ مناہل نے منزل کو محبت پانے کا نسخہ
 بتایا۔

”ڈیئر مناہل...! آپ کی فرینڈ کو نسبت والے سے محبت نہیں ہے، نسبت طے کرنے والے سے عشق
 ضرور ہے، حکیم صاحب نے مجھے بتایا تھا۔ میں نے ساری زندگی اپنے پیرنٹس سے نفرت کی۔ اب اپنی محبت
 پانے کے لیے کسی کے عشق سے ٹکرانا نہیں چاہتا، ویسے بھی محبت خلوص سے جیتی جاتی ہے چالاکی سے نہیں۔
 ایک بات بتاؤں مناہل معید انصاری۔ چوہدری ماجد کی پچھلے دس سال کی ہسٹری میرے پاس ہے
 آڈیو، ویڈیو کے ساتھ۔ مجھے پتا ہے ماہم اُسے جواز بنا کر بھی انکار نہیں کرے گی۔ میں خود بھی چوہدری ماجد
 سے انکار کر داسکتا ہوں، لیکن ایسا میں نہیں کروں گا۔“ منزل نے اپنی محبت کے اصول بتائے جو مناہل کو پسند نہ
 آئے تھے۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
 ”کیا لاہور اور گوجرانوالہ کے درمیان کوئی مینٹل ہاسپٹل ہے؟ آئی ایم ڈپریس اور تم دونوں کو کوئی فکر
 ہی نہیں ہے۔ ایک مہینے بعد منزل بیگ...! اُس کی شادی ہے۔“ مناہل نے سختی سے شادی پر زور دے کر کہا
 تھا۔ اُتنی ہی دھیرج سے منزل نے جواب دیا:

”مجھے پتا ہے۔“

”تمہیں پتا ہے... اوکے... بائے...“ مناہل نے غصے سے موبائل بیڈ پر پٹخ دیا۔

”کیوں غصہ کر رہی ہو؟“ ماہم نے قدرے اطمینان سے پوچھا۔

”کیوں غصہ کر رہی ہو؟ یہ تم پوچھ رہی ہو۔ ایک مہینے بعد تمہاری اُس جانور چوہداری ماجد کے ساتھ
 شادی ہے۔ دن کو اُس گدھے کے منہ میں تمباکو والے پان ہوتے ہیں اور رات کو اُس کے ہاتھ میں شراب کا
 گلاس۔ سارے علاقے میں اُس کی ریپوٹیشن بھی خراب ہے۔ تم کیوں کپڑا مائز کر رہی ہو میری سمجھ سے باہر
 ہے۔ ماہم میں تایا ابو سے کہتی ہوں وہ ماجد کے ابا سے بات کرتے ہیں۔“ اس بار مناہل قدرے خفا تھی۔

”دفعہ کرو شادی کو... تم یہ بتاؤ تم نے اُن کا نمبر ”میم“ کے نام سے کیوں SAVE کیا ہے؟“ ماہم
 سنگھار میز کے سامنے سے اُٹھی، بیڈ سے مناہل کا فون اُٹھایا اُسے شانت کرنے کے لیے اُس کے گال پر اُلٹ
 سے ہاتھ پھیرا اور بڑی محبت سے اُسے بیڈ پر اپنے سامنے بٹھالیا۔ ماہم نے بھی منزل کی طرح دھیرج کا
 مظاہرہ کیا۔ اُس نے یہ سب کچھ ہولے ہولے رُک رُک کر کہا تھا۔ مناہل کے چہرے پر حیرت بکھری ہوئی
 تھی۔

”میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔“ ماہم نے مناہل کو ہلا کر دوبارہ کہا۔

”کیا پوچھا تھا؟“ وہ ایسے بولی جیسے نیند سے جاگی ہو۔

”اُن کا نمبر ”میم“ کے نام سے کیوں SAVE کیا ہے؟“

”مجھے چائے پلداؤ۔“ مناہل نے سنی اُن سنی کر دی۔

ماہم کمرے سے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ چائے لے کر لوٹی تھی۔ چائے پینے کے دوران اُن
 دونوں میں مزید کوئی بات نہیں ہوئی۔

”تم نے اپنے اسکول کا نام کیوں ”میم“ رکھا ہے؟“ مناہل نے بتانے کی بجائے اُلٹا پوچھ لیا۔

”ابو جی کہا کرتے تھے ساری کائنات دو میموں کے صدقے سے وجود میں آئی۔ کہتے تھے ”م“ سے

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

شروع ہونے والا سفر ”م“ سے ہو کر اپنی منزل تک پہنچا تھا۔“

”م... سے... م... میں سمجھی نہیں۔“ منابیل نے حیرانی سے پوچھا۔

”مکہ سے مدینہ... پھر مسجد، منبر، محراب تک... مسلمان سے مؤمن کے مرتبہ و مقام تک... ماں کی

ممتا سے ماں تک... محرم سے محبت... پھر محبوب سے مختار تک...

مکہ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج تک... سب کچھ ”م“ سے شروع ہو کر ”م“ پر ختم ہوتا ہے۔

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر

وہی قرآن وہی فرقاں وہی یاسیں وہی طہ

منابیل نے اپنی سانسیں روک لیں جب ماہم بات کر رہی تھی۔

”یہ سب کچھ انکل جی کہا کرتے تھے؟“ منابیل نے اشتیاق سے پوچھا۔

”ہاں...! ابو جی کو میم سے شروع ہونے والے ناموں سے بڑی محبت تھی۔ اسی لیے ہم دونوں

بہنوں کا نام انھوں نے میم سے ہی رکھا ماہم اور مومنہ۔“

”ماہم جی...! آپ کے گھر کے سارے افراد کے ناموں میں دو میمیں آتی ہیں۔ محمود، مریم، مومنہ،

ماہم اور چوہدری ماجد کے نام میں ایک ”م“ ہے۔ منزل میں دو... ہیں۔ تمہارا تو پتہ نہیں البتہ مجھے اپنے

سارے سوالوں کے جواب مل گئے۔ اچھا میں چلتی ہوں۔“ منابیل نے یہ کہا اور مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے

چلی گئی۔

اگلے دن صبح فجر کے بعد سب نمازیوں کے جانے کے بعد منزل مسجد سے باہر نکلا۔ ماہم جبین کے

چہرے والی ماہم کی منتظر نگاہیں مرکوز تھیں منزل کے مکھڑے پر لکھی ہوئی تحریر کا متن پڑھنے کے لیے۔ منزل کی

آنکھوں کا مرکز و محور ماہم کی مقدس آنکھیں تھیں۔ کوئی نظر سے سیراب ہو جاتا ہے کسی کو لمس چاہیے ہوتا ہے۔

چند لمحوں میں ہی اُن دونوں کی نگاہوں نے صدیوں کی مسافت طے کر کے اپنی اپنی منزلوں کو پالیا تھا۔

موسم کوئی بھی ہو محبوب کو دیکھ کر من مہکے لگتا ہے، مسرتوں کی کلیاں کھل کھل جاتی ہیں، ملن کی آرزو

میں میٹھے میٹھے نغمے بجنے لگتے ہیں۔

حسب معمول منزل گردن جھکائے اپنی گاڑی میں بیٹھا ہی تھا گاڑی میں پڑا ہوا موبائل بج اُٹھا۔

”السلام علیکم منابیل...!“ منزل نے کال ریسپونڈ کی۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
 ”وعلیکم السلام...! تایا ابو نے آپ کو بیٹھک میں بلایا ہے۔“ منابل نے مختصر بات کی اور فون رکھ دیا۔

مزل کو کچھ فکر لاحق ہوئی وہ نظریں جھکائے گلی سے گزرا۔ ماہم اُس وقت بھی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ مزل نے اُس کی طرف نہیں دیکھا۔

”السلام علیکم حکیم صاحب...! آپ نے بلایا تھا؟“ مزل نے بیٹھک میں داخل ہوتے ہی کہا۔ حکیم صاحب اُس کے استقبال کے لیے پہلے سے کھڑے تھے۔

”وعلیکم السلام...! بیٹھو مزل بیٹا...! پہلے ناشتا کر لیں بعد میں بات کریں گے۔“
 ماہم اپنے کمرے میں بے چین ہو گئی تھی۔ اُس کے دل کی دھڑکن تیز تھی۔ خیالوں کی نگری سے کئی خیال نکل نکل کر فشارِ خون کو تیز کر رہے تھے۔ قدم رکنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک نہ جانے کتنے ہی چکر لگا چکی تھی۔

”دُنیا میں پہلا قتل عورت کی وجہ سے ہوا تھا۔“ حکیم صاحب نے ٹٹولتی نظروں سے مزل کو دیکھ کر کہا۔
 ”مجھے علم ہے۔“ مزل نے اعتماد سے جواب دیا۔

”جہاں حاجت ختم ہو، علم وہاں سے شروع ہوتا ہے، علم کا علم ہونا لاعلمی ہے۔ جو تم دونوں کر رہے ہو وہ غلط ہے گناہ ہے، وہ تمہارے لیے نامحرم ہے تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اُس کی نسبت کسی اور سے طے ہے۔“
 حکیم صاحب نے نخل اور حکمت سے مزل کو سمجھایا۔

”جس منفی چیز کی نسبت اللہ کی طرف ہو جائے وہ مثبت بن جاتی ہے۔ میں اُس نامحرم سے نکاح کر کے اُسے محرم بنانا چاہتا ہوں۔“ اس بار مزل کے آواز میں اُلفت کے ساتھ ساتھ درد بھی تھا۔
 ”یہ ناممکن ہے۔ وہ شادی سے انکار نہیں کرے گی۔ تم اُس کی اجازت کے بغیر رشتہ بھیجو گے نہیں۔“
 اُس نے مجھے اپنے تایا سے بات کرنے سے منع کر دیا ہے اور تم نے کہا ہی نہیں۔ مزل بیٹا...! دستک دینے سے دروازہ کھلتا ہے، دُعا مانگنے سے مرادیں ملتی ہیں۔“

”حکیم صاحب...! دستک دینے کی اجازت نہیں۔ رہا سوال دُعا مانگنے کا۔ ساری زندگی اُس کی ناشکری کی ہے۔ ہمیشہ محبتیں لُٹنے کا گلہ کیا ہے۔ اب کس منہ سے محبت مانگوں؟ اب سوچا ہے جو وہ عطا کر دے گا اُس پر شکر کروں گا، جو نہیں دے گا اُس پر صبر۔“ مزل نے لرزتی آواز میں کہا۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”صبر... صبر بڑی دُور کی منزل ہے بیگ صاحب...! جوں گیا اُس پر راضی ہو جاؤ جو نہیں ملا اُس پر شکر کرو۔ صبر کا مقام اس سے بہت آگے بہت ہی دُور ہے۔ صبر اور شکر سے پہلے کوشش ہے جو تم نے کی ہی نہیں۔“ حکیم صاحب نے ہونٹوں پر تبسم سجائے اپنا نقطہ نظر بیان کیا۔

”کوشش اس دُور سے نہیں کرتا محبت کے حضور میں کہیں بے ادبی نہ ہو جائے۔ میں تو پہلے ہی محبت کی درگاہ سے راندہ درگاہ ہوں۔“

”مزل بیٹا...! پھر دُعا ہی واحد رستہ ہے۔ اُسے دُعا مانگنے والے بہت پسند ہیں... گناہ گار ہوں یا نیک و کار... شکر والے ہوں یا ناشکرے... بس ہاتھ اٹھانے کی دیر ہے۔“ حکیم صاحب نے شائستگی سے حل بتایا۔

”مجھے اجازت دیں فیکٹری پہنچنا ہے۔“ مزل نے اجازت لی اور بیٹھک سے نکل آیا۔

ماہم کو مزل کی مہک کھڑکی تک کھینچ لائی۔ وہ گردن جھکائے اُس کی گلی سے گزر گیا۔ ماہم کی نظروں نے مزل کو گاڑی تک چھوڑا۔ گاڑی کے جانے کے بعد بھی کچھ دیر تک ماہم کی نظریں اُسی مقام کو دیکھتی رہیں جہاں اُس کے من کے میت کی سواری کھڑی تھی، وہ پلٹی تو مناہل اُس کے پیچھے موجود تھی۔

”تم یہاں؟“ ماہم نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں میں... آنٹی اور مومنہ تمہارے کمرے میں پہلے ہی کم آتی ہیں اب میرے آنے پر بھی پابندی لگا دو۔“ مناہل نے گھورتے ہوئے کہا۔

”ایسا سوئڈ بوئڈ ایک دم کام ڈون ٹائپ کا عاشق پہلی بار دیکھا ہے۔ مجھے یہ تو بتاؤ محبت کی کوئی الگ کوالیفیکیشن ہے جس میں تم دونوں نے سپیشلائزیشن کی ہوئی ہے۔ ایسی بڑی بڑی باتیں کرتے ہو تم دونوں جو میری جیسی بندی کی سمجھ سے باہر ہیں۔ تایا ابو تو عالم فاضل آدمی ہیں وہ مشکل بات کریں تو سمجھ آتی ہے۔ سیدھی سی بات ہے۔ ایک لڑکا تمہیں محبت کرتا ہے تم بھی اُسے چاہتی ہو۔ تمہارا فیانسی تمہیں پسند نہیں ہے۔ انکار کر دو سمپل۔ ماہم تمہیں کیوں سمجھ نہیں آرہی ہے۔ میری مثال تمہارے سامنے ہے۔ تایا ابو نے میرے لیے معین کو پسند کیا تھا۔ میں مجتبیٰ سے محبت کرتی تھی۔ تمہیں اپنے دل کی بات بتا دی۔ تم نے تایا ابو سے بات کی وہ مان گئے۔ مجتبیٰ کی خواہش پر تایا ابو نے ہمارا نکاح بھی پڑھا دیا۔ سیدھی سادھی سی کو اسٹوری۔ تمہاری محبت انگلش کے ٹینسوں کی طرح بہت ہی مشکل ہے۔“ مناہل نے ماہم کو لمبا چوڑا بھاشن دیا ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”میں انکار ہی تو نہیں کر سکتی سارے شریکے برادری میں۔ ابوجی کی تھو تھو ہو جائے گی۔ سارا شریکا کہے گا ہیڈ ماسٹر چوہدری محمود معراج کی بیٹی نے اپنے مرے ہوئے باپ کی زبان کی لاج بھی نہ رکھی۔“

”تم لاج رکھ لو، بھلے ہی منزل کی محبت کا جنازہ نکل جائے۔“ منابل نے ترش لہجے میں کہا۔

”پتا نہیں تم نے کہا تھا یا اُس نے، چالاکی سے محبت نہیں جیتی جاتی۔ تم دونوں کی باتیں بھی ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ تم ماجد کا سارا بانیوڈیٹا کھول کر اپنے تایا جی کے سامنے رکھ دو۔“

”تایا جی ماجد کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں۔“ ماہم نے بے تاثر چہرے کے ساتھ جواب دیا۔

”سب کچھ جانتے ہوئے بھی؟“ منابل نے حیرانی سے پوچھا۔

”اُن کی بھی زبان کا سوال ہے۔ میں اُن کے بیٹے کی منگ ہوں۔ ہمارے خاندان میں لوگ مر جاتے ہیں منگ نہیں چھوڑتے۔“

”2015ء میں بھی؟“ منابل کو دھچکا لگا تھا۔

”ہاں!...!“ ماہم نے بڑی مشکل سے کہا۔ وہ ضبط کے باوجود اپنے انشک نہ روک سکی۔ منابل نے اُس دن ماہم کے ابو کے انتقال کے بعد اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے ایک مہینہ گزر گیا۔ بارات سے ایک دن پہلے منزل نماز پڑھ کر نکلا۔ وہ کھڑکی میں کھڑی تھی مرجھائے ہوئے سرخ گلاب کی طرح۔ اُس دن اُس کی لمبی آنکھوں میں اُدا سی تھی۔ خاموشی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں کوئی عبارت نہیں تھی جسے منزل پڑھتا۔ صرف ہجر کے سندیسے تھے۔ منزل نے ایک نظر دیکھا اور چل دیا۔

وہ ماسٹر محمود کے دروازے کے آگے سے گزر رہا تھا ایک آواز نے اُس کے قدم رُوک لیے:

”بیٹا اندر آ جاؤ...!“ مریم بی بی نے ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے مختصر بات کی اور دروازے سے اندر ہو گئی۔ گلی میں کوئی نہیں تھا۔ منزل شش و پنج میں مبتلا تھا۔ لمحہ بھر اُس نے سوچا پھر وہ بھی دروازے سے گھر کے اندر چلا گیا۔

”بیٹھو بیٹا...!“ ماہم کی ماں مریم نے ڈرائنگ روم میں منزل کو بٹھایا۔ منزل جھکتے جھکتے بیٹھ گیا۔

”کل رات کو ماہم کی بارات ہے۔ آج پچھلے ٹائم مہمان آنا شروع ہو جائیں گے۔ کچھ مہمان رات کے آچکے ہیں۔ اُنھیں میں نے گاؤں والی حویلی میں ٹھہرایا ہوا ہے۔ کل سے تم یہاں نہیں آؤ گے۔“ مریم بی بی

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

نے تفصیل بتانے کے بعد فرمان جاری کیا۔

”کیوں؟“ منزل نے اعتماد سے نظریں ملا کر پوچھا۔

”اس لیے کہ کل سے وہ کھڑکی نہیں کھلے گی۔“ مریم بی بی نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

”حاضری میں دیدار کی شرط نہیں ہوتی۔“

”ادب والے حکم عدولی نہیں کرتے۔“ مریم بی بی نے پرکھتی نظروں سے منزل کی طرف دیکھ کر کہا۔

”بے وفائی کے علاوہ سب حکم مانوں گا۔“ منزل نے عاجزی سے جواب دیا۔

”وفا کا دم بھرنے والے محبوب کو بدنام نہیں کرتے۔“

”اُس کی بدنامی نہ ہوئی ہے... نہ ہوگی... یہ میرا وعدہ ہے۔“ منزل نے یقین دلانے کی کوشش کی۔

”کب تک یہاں آتے رہو گے؟“ مریم بی بی نے روکھے انداز سے پوچھا۔

”اب تو میں یہاں سے جانا ہی نہیں چاہتا۔ سوچ رہا ہوں یہیں شفٹ ہو جاؤں۔“

”کس لیے؟“ مریم بی بی نے برہمی سے کہا۔

”تاکہ بند کھڑکی کو دیکھتا رہوں۔“ منزل نے دھیمی آواز میں عرض کی۔

”بند کھڑکی کو دیکھنے کا فائدہ؟“ مریم بی بی نے طنز کیا۔

”محبت میں فائدہ نقصان نہیں دیکھا جاتا۔“ منزل نے اطمینان سے جواب دیا۔

”مناہل ٹھیک کہتی ہے۔ تم دونوں واقعی پاگل ہو۔“ مریم بی بی نے فوراً اپنا لہجہ اور رویہ بدل لیا۔

”دیکھو منزل بیٹا...! میں کچھ نہیں کر سکتی۔ میری بیٹی کے لیے تم سے اچھا لڑکا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

میری خواہش کے باوجود اُس کی شادی تم سے نہیں ہو سکتی۔ شادی کے بعد پتا نہیں کیا ہو گا۔“ مریم بی بی نے

فکرمندی سے کہا تھا۔

”اور کسی بات کا تو مجھے بھی پتا نہیں۔ ایک بات کنفرم ہے۔ میں اپنی نظر پر پردہ ضرور ڈال دوں گا۔“

یہ کہہ کر منزل چپ چاپ گردن جھکائے وہاں سے چلا گیا۔

”تمھاری ماجد سے شادی ہونے کے بعد بھی یہ ونڈو اوپن کرو گی؟“ مناہل نے ماہم کو جھنجھوڑ کر

پوچھا تھا۔ ماہم اب بھی گم سم تھی۔ مناہل نے دوبارہ اُسے ہلایا۔

”ٹیل می۔“

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
 ”نہیں... کبھی نہیں۔ میں منزل کی طرف کھلنے والی ساری کھڑکیاں بند کر دوں گی۔ چاہے وہ دل کی
 ہوں یا لکڑی کی۔“ ماہم نے بانیں ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو صاف کیے تھے۔

تیل مہندی کی رسم ماہم کے اسکول کے گراؤنڈ میں انجام پائی۔ بارات کا انتظام ملن میرج ہال میں
 کیا جانا تھا۔ مہندی کی تقریب کے دوران ماہم کی طرح مناہل بھی بجھی بجھی سی رہی۔ بارات والے دن صبح
 منزل مسجد کے زینے اُتر رہا تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود وہ اپنی نظر کو روک نہیں سکا۔ نظر اُٹھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح
 کھڑکی میں کھڑی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں نور کی بجائے ظلمت تھی۔ اُداسی کے ساتھ ساتھ ویرانی بھی تھی۔
 ماہم ہاتھوں میں مہندی رچائے، کلائیوں میں گجرے پہنے، گلے میں مالا ڈالے، مہندی کے پیلے جوڑے میں
 ملبوس تھی۔ وہ من موہنی سی لڑکی ماہ پارہ لگ رہی تھی۔ یہ تو اُس کا ظاہر تھا۔

اصل میں مہندی کی ٹھنڈک کے بجائے اُسے تپش محسوس ہو رہی تھی۔ کلائیوں کے گجرے تھکڑیاں
 لگ رہی تھیں۔ گلے کی مالا پھانسی والی رسی جیسی تھی۔ پیلا لباس اُس کے نزدیک اُسے ماتمی لباس کی کیفیت
 میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔ چند رکھی کی طرح نظر آنے والی ماہم اُس وقت اندر سے پارو نہیں بلکہ پارہ ہو چکی
 تھی۔

منزل اور ماہم کے مابین کوئی میثاق، کوئی معاہدہ طے نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ دونوں اپنے اپنے
 محاذ پر مجرم بنے کھڑے تھے۔ کس نے کس کو مجروح کیا یہ معتمد تھا۔ پھر بھی وہ دونوں مضطرب تھے۔ ملاقات
 کے بغیر صرف محبت کی معرفت سے اُن دونوں کے جسم معطر ہو چکے تھے۔ اُس مسافت کے دوران اُنھیں
 محبت کی مہک تو میسر آئی محبت کی منزل نہیں ملی۔ اُن کے ملن کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔
 مہندی کی تقریب کے بعد سے ماہم کھڑکی میں مجسمہ بنی کھڑی تھی۔ رات بھر وہ صبح کا انتظار کرتی
 رہی۔

جس کے انتظار میں وہ کھڑی تھی وہ اُس کے سامنے تھا۔ وہ اپنے نکاح سے پہلے شاید آخری بار اُسے
 دیکھ رہی تھی۔ منزل نے بھی اُسے لمحوں کے اندر اندر صدیوں جیسا دیکھ لیا۔ اُس کے دل میں پتا نہیں کیا بات
 آئی وہ واپس مسجد کے اندر چلا گیا۔ چند منٹوں کے بعد وہ واپس آیا ماہم وہیں کھڑی تھی۔ منزل نے اُسے ہمیشہ
 کی طرح ایک نظر دیکھا اور نظریں جھکائے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر لاہور چلا گیا۔
 اب جاگنے کی باری منزل بیگ کی تھی۔ وہ رات بھر اپنے ٹیرس پر صبح کا انتظار کرتا رہا۔ بند کھڑکی کو

زندگی کے بعد... موت سے پہلے
دیکھنے والی مشتاق آنکھیں اس بار مزمل بیگ کی تھیں۔ اُس کے ذہن میں کچھ نہیں تھا سوائے اُس کھڑکی کے کہ وہ جلد از جلد اُس کھڑکی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ نماز سے پہلے دیکھنے کی اجازت اُس کو نہیں تھی۔

مزمل گردن جھکائے گلی سے گزر گیا۔ اُس کے دل میں کھڑکی کا کوئی خیال نہیں آیا۔ اُس نے خشوع و خضوع سے نماز ادا کی۔ سب نمازیوں کے جانے کے بعد وہ حسبِ معمول اُٹھا اور مسجد کے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ اُسے کبھی بھی مسجد کی حدود میں کھڑکی یا کھڑکی والی کا خیال نہیں گزرا۔ اُس دن بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ مزمل نے سیڑھیاں اُترنی شروع کیں۔ نظر اُٹھی کھڑکی کھلی تھی۔ ماہم دُہن بنی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ مزمل نے ہمیشہ کی طرح ایک نظر دیکھنے کے بعد اپنی نظریں جھکا لیں۔ مزمل کی آنکھوں میں بجھے دیپ جل اُٹھے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ لوٹ آئی۔ دل سے دھک دھک کی آواز آنے لگی۔ دل کی دھک دھک دماغ سے برداشت نہیں ہوئی۔ دماغ کہنے لگا:

”مزمل بیگ...! کھلی کھڑکی کے پیچھے دُہن کھڑی ہے۔ خوش ہونے کی بجائے پتا تو کر لو وہ کس کی دُہن ہے؟“

دل نے حکم دیا:

”مزمل بیگ...! نظریں اُٹھاؤ اور دوبارہ دیکھ لو میرا دھڑکنے والے وجہ نہیں ہوتا۔ میری دھڑکن زندگی کی علامت ہے۔“

”نظریں اُٹھاؤ گے تو بے ادبی ہو جائے گی۔“ دماغ نے جلدی سے مٹیج دیا۔ اُسی لمحے دل نے بھی صدا لگا دی:

”مسٹر برین...! آپ عقل والوں کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں اور میں عشق والوں کا ساتھی ہوں۔ مزمل بیگ تم نظریں اُٹھاؤ۔“

مزمل نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ ماہم کے چہرے پر عجیب طرح کی مسرت تھی۔ وہ تھوڑی دیر اُسے دیکھتا رہا۔ آنکھوں کی گفتگو سے دلوں کو سکون مل گیا۔ مزمل کو گلی میں کھڑے ہو کر مزید اس طرح دیکھنا غیر مناسب لگا۔ وہ نظریں جھکا کر اپنی گاڑی کی طرف چل دیا۔

”بیٹا اندر آ جاؤ...!“ مریم بی بی نے بڑے اعتماد سے کہا جو اپنے دروازے پر کھڑی تھیں۔

مزمل گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ ڈرائنگ روم میں ایک آدمی ویل چیئر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے سامنے

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

حکیم مسلم انصاری، مہتاب خان اور مبشر حسین (مزل کا ڈرائیور) بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسرے صوفے پر چند عورتیں تھیں جن میں مسرت، مومنہ اور منابل بھی شامل تھیں۔

”جوان!... میری بیٹی سے شادی کرو گے؟“ چوہدری مقصود نے گرجتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

اس سے پہلے مزل کچھ کہتا ڈرائنگ روم میں ماہم دُہن کے لباس میں ملبوس داخل ہوئی۔ مزل نے حیرانی سے چوہدری مقصود کی طرف دیکھا۔

”جوان!... میری بیٹی ماہم سے شادی کرو گے؟“ چوہدری مقصود اُسی انداز میں دوبارہ بولا۔

”جی!...“ مزل نے ماہم کی طرف دیکھ کر کہا۔

”حق مہر میں کیا لکھواؤ گے۔“ چوہدری مقصود نے بے دھڑک ہو کر کہہ دیا۔

”یہ والی فیکٹری لکھ لیں۔“ مزل بیگ نے جتنی انداز میں جواب دیا۔

ماہم نے مزل کی طرف دیکھا۔ ڈرائنگ روم میں موجود سب لوگوں نے باری باری ایک دوسرے کی طرف نگاہ ڈالی۔ اُن کے چہروں پر ملی جلی کیفیات تھیں۔ خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی نمایاں تھی۔

”حکیم صاحب!... بسم اللہ کریں۔“ چوہدری مقصود نے نکاح پڑھانے کا فرمان جاری کر دیا۔

”چوہدری مقصود... یہ نکاح نہیں ہو سکتا۔“ ایک آدمی گھن گرج کے ساتھ بولا۔

”کیوں نہیں ہو سکتا یہ نکاح؟“ چوہدری مقصود نے لٹکار کر پوچھا۔

”اس لیے کہ تیرے بیٹے نے ہماری بہن سے شادی کر رکھی ہے۔ اب وہ دوسری شادی نہیں کرنا

چاہتا۔“ مہربان علی نے وضاحت پیش کی۔

”کیوں اوئے ماجد...؟“ چوہدری مقصود نے قہر و غضب سے پوچھا۔

”جی ابا جی!...“ ماجد نے نظریں جھکا کر فوراً اقرار کر لیا۔

”اوئے کھوتے دے پتر!... پھر یہ تماشا لگانے کی کیا ضرورت تھی۔“ چوہدری مقصود ویل چیئر پر

بیٹھے بیٹھے ہی آپے سے باہر ہو گیا تھا۔

”تو مجھے پہلے بتا دیتا... بے غیرتا... بے شرما... اب میں سارے شریکے کو کیا جواب دوں گا... کون

کرے گا میرے مرحوم بھائی کی بیٹی سے شادی؟“ چوہدری مقصود نے واہ ویلا ڈالا ہوا تھا۔

”کھانا کھول دو۔“ حکیم صاحب نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے میرج ہال کی انتظامیہ کو کہہ

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

دیا۔ خود چوہدری مقصود کی ویل چیر کو دھکا لگاتے ہوئے دلہن کے کمرے میں لے گئے تھے۔ چند منٹوں بعد ہی سارا ہجوم تتر بتر ہو گیا۔ شادی ہو یا نہ ہو لوگوں کو کھانا ملنا چاہیے۔ لوگوں نے کھانا کھایا، اپنے اپنے ہاتھ صاف کیے اور اپنے اپنے گھروں کو راہ لی۔

”کون کرے گا میرے بھائی کی بیٹی سے شادی؟“ چوہدری مقصود نے مگرچھ والے آنسو گراتے ہوئے پھر سے پوچھا۔

”ایک لڑکا ہے میرے رشتے میں بھی لگتا ہے۔ وہی جس نے سیٹھ مجیب کی فیکٹری خریدی ہے۔“ حکیم صاحب نے تسلی دی۔

”وہ اتنا بڑا آدمی ہے، وہ کیوں کرے گا شادی؟“ چوہدری مقصود کے آنسو فوراً غائب ہو گئے تھے۔ ساتھ ہی اُس نے تفتیش بھی شروع کر دی۔

”اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ سے رشتہ مانگوں۔ جب میں نے بتایا کہ ماہم کی مگنی ہو چکی ہے پھر وہ کہنے لگا حکیم صاحب...! آپ ہی میرے بڑے ہیں۔ آپ جہاں کہیں گے میں شادی کر لوں گا۔“ ”مگر... پھر بھی... حکیم صاحب... مجھے نہیں لگتا... وہ لڑکا مانے گا۔“ چوہدری مقصود نے رُک رُک کر اپنے خدشے ظاہر کیے۔

”انکل جی...! آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔ اُس کی کیا مجال وہ تایا ابو کی بات ٹالے۔ ہماری ماہم راج کرے گی۔ اُس کے پاس ایسی دو فیکٹریاں اور ہیں۔ دو بنگلے تین گاڑیاں اور کروڑوں کا بینک بیلنس الگ سے ہے۔“ مناہل نے ماہم کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ جو اُس کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

چوہدری مقصود کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اُس وقت برائیڈل روم میں صرف پانچ افراد تھے۔ پانچویں مریم بی بی تھیں جو کچھ دیر بعد آئی تھی۔

”کچھ بھی ہو۔ میں ماہم کی رضامندی کے بغیر ہاں نہیں کر سکتا۔“ چوہدری مقصود نے اپنا لالچ چھپاتے ہوئے سنبھل کر کہا۔

”لالہ جی...! ماہم اور مجھے آپ کے کسی فیصلے پر کوئی اعتراض نہ پہلے تھا اور نہ ہی آئندہ ہوگا۔ آپ جو بھی فیصلہ کریں ہمیں قبول ہوگا۔“ مریم بی بی نے تابع داری کے ساتھ ساتھ اپنے حصے کی ڈیوٹی پوری کر دی۔

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

”تو پھر حکیم صاحب...! ابھی اُس لڑکے کو بلا لیں۔ ابھی کلمے پڑھا دیتے ہیں۔ اللہ اللہ خیری سلمہ۔“
چوہدری مقصود نے اپنی عزت بچانے کے لیے فوراً رضا مندی ظاہر کر دی تھی۔

”چوہدری صاحب...! اس وقت غیر مناسب ہے۔ میں اُس سے فون پر بات کر لیتا ہوں۔ ان شاء اللہ کل صبح فجر کے بعد میں نکاح پڑھوا دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ آپ آج رات یہیں رُک جائیں۔ گاؤں مت جائیں۔ کل نکاح کے بعد ہی گاؤں جائیے گا۔ اس طرح آپ کی عزت بھی رہ جائے گی اور شریکے برادری کو باتیں بنانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔“ حکیم صاحب کی بات چوہدری مقصود کے دل پر جا کر لگی تھی۔ وہ فوراً مان گیا۔

ماہم اپنے کمرے میں آئی۔ اُس نے جنوری کی سخت سردی کے باوجود اپنی کھڑکی کھول دی۔ وہ دُہلن بنی ہوئی مسجد کی سیڑھیوں کو دیکھنے لگی۔ جہاں آج صبح منزل کھڑا تھا۔ اُس نے ماہم کو دیکھا نظریں جھکائیں اور واپس مسجد میں چلا گیا۔

”وہ واپس مسجد میں کیا لینے گیا ہے؟“ اُس وقت ماہم کھڑکی میں کھڑی ہوئی یہ سوچ رہی تھی۔
”ہر شے من جانب اللہ ہے۔ یا اللہ...! اے میرے مالک...! میں نے تجھ سے مانگنا چھوڑ دیا تھا۔ آج مانگتا ہوں اپنی محبت کو۔ مالک...! تو مسبب الاسباب ہے، میں نہیں جانتا تو کیسے کرے گا بس تو ہی کر سکتا ہے۔ مجھے ماہم عطا کر دے پورے مرتبے اور مقام کے ساتھ۔“ منزل مسجد میں آنے کے بعد سجدے میں گر گڑا رہا تھا۔ اُس کے اشکوں سے مصلیٰ بھیگ گیا تھا۔ اُس نے دُعا مانگی۔ رومال سے اپنی بھیگی پلکیں صاف کیں۔ سیڑھیاں اُترتے ہوئے ایک نظر اپنے محبوب پر ڈالی اور لاہور چلا گیا۔
وہ ٹیرس پر کھڑا ہوا رات بھر کھڑکی کے متعلق سوچتا رہا اور ماہم رات بھر کھڑکی سے باہر سیڑھیوں کو دیکھتی رہی۔

فجر کے بعد نکاح پڑھا کر حکیم صاحب نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ ماہم پورے مان سمان کے ساتھ اپنے گھر سے رخصت ہوئی تھی۔ اُس کے باپ کی زبان بھی جیت گئی اور ماہم نے اپنا محبوب بھی پالیا تھا۔ ملن شادی ہال سے شروع ہونے والی کہانی ملن پر ہی ختم ہوئی۔

منزل کی ”م“ اور ماہم کی ”م“ محبت کے ملن کے بعد بن گئی پھر سے ”میم“

☆.....☆.....☆

زندگی کے بعد... موت سے پہلے

شکیل احمد چوہان صاحب کا نیا آنے والا ناول

دل در بدر

مقبول و معروف ادیب
شکیل احمد چوہان
کا ایک خوب صورت ناول



مستند اسلامی، ادبی اور اصلاحی کتب کا مرکز
اردو بازار، لاہور
042-35912676
0321-4084824
0334-9892450 Email: darulmashaf@gmail.com



kutubistan.blogspot.com